اردو کا کلاسیکی ادب
مرقع
لیلیٰ مجنوں
از
مرزا محمد ہادی رسوا
مرتبہ
عشرت رحمانی
مجلس ترقی ادب ۔ لاہور

بعونِ صناعِ مکین و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان
۳۰
اردو کا کلاسیکی ادب
مرقع
لیلیٰ مجنوں
از
مرزا محمد ہادی رسوا
ناشر
مجلسِ ترقیِ ادب
۲- نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ
لاہور

طبع اول : مارچ ، ۱۹۶۳ء

تعداد : ۲۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج (ستارۂ امتیاز)
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ، لاہور

مہتمم : محمد ذوالفقار خاں

قیمت :
سفید کاغذ پر : ~~دو روپے پچاس پیسے~~
اخباری کاغذ پر : ایک روپیہ پچھتر پیسے

ابتدائیہ

مرزا محمد ہادی (مرزا اور رسوا) جنوری یا فروری ۱۸۵۸ء میں بہ‌مقام لکھنؤ پیدا ہوئے - مرزا صاحب کے والد کا نام آغا محمد تقی تھا، وہ ماژندرانی امرا میں سے تھے - ان کا خاندان مدت مدید سے لکھنؤ میں مقیم تھا اور وہاں کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا - آغا محمد تقی ریاضی اور نجوم میں ماہر کامل اور فارسی عربی کے جیّد عالم تھے، انھوں نے صاحبزادے کو ابتدا میں خود ہی تعلیم دی اور یہ علوم مرزا رسوا نے انھیں سے حاصل کیے -

مرزا صاحب کی عمر مشکل سے سولہ سال کی ہوگی کہ ان کے والد صاحب نے وفات پائی اور ان کے بڑے بھائی مرزا محمد ذکی کا بھی انتقال ہو گیا، والدہ کی وفات پہلے ہی ہو چکی تھی - چونکہ والدہ ہی صاحبِ جائداد تھیں اس لیے مرزا صاحب کے ماموں اور خالہ نے تمام املاک پر قبضہ کرکے تھوڑے دنوں ان کی بھی سر پرستی کی لیکن جب تمام جائداد لٹا دی تو مرزا صاحب بے یار و مددگار رہ گئے -

منشی حیدر بخش عرف حسین بخش خوش نویس جو آغا محمد تقی مرحوم کے مخلص دوست اور مرزا صاحب کے اُستاد بھی تھے، انھوں نے رسوا کی سر پرستی کی مگر چوں کہ کسی قریبی عزیز بزرگ کا سایہ ان کے سر پر نہ تھا، رسوا لکھنؤ کی صحبت میں بانکوں جیسی زندگی بسر کرنے لگے - منشی حیدر بخش نے جب ان کا یہ حال دیکھا تو فیض آباد کے ایک شریف خاندان میں ان کی

شادی کرا دی جس سے ان کی بڑی اصلاح ہوئی ۔

ان کی بیوی نہایت نیک ، سلیقہ مند اور با حوصلہ خاتون تھیں ؛ انھوں نے مرزا صاحب کو مروجہ علوم انگریزی کے حصول کی طرف راغب کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسوا نے منشی کا امتحان پاس کر کے میٹرک میں کامیابی حاصل کر لی لیکن رسوا کی قسمت ! وفا شعار اور علم دوست بیگم کی عمر نے بھی وفا نہ کی اور یہ ان کی جدائی کا رنج اٹھانے پر مجبور ہوئے ؛ چناں چہ بیوی کی وفات کے بعد مرزا صاحب نے لکھنؤ سے بد دل ہو کر اسے خیر باد کہا اور رڑکی جا کر انجینیئرنگ کالج میں داخل ہو گئے ۔ رڑکی سے اوورسیری کا امتحان پاس کر کے محکمۂ ریل میں ملازمت اختیار کی اور بلوچستان چلے گئے ؛ کہتے ہیں کوئٹہ لائن کا سروے مرزا صاحب ہی نے کیا ہے ۔

رسوا کی تنوع پسند و ہمہ گیر طبیعت کسی ایک گھر بند نہ تھی، اس ملازمت کے دوران میں انھیں کیمسٹری اور مکینک کا شوق ہوگیا ؛ چناں چہ ملازمت چھوڑ کر لکھنؤ پہنچے اور جو سرمایہ بھی موجود تھا ، اسے فروخت کر کے انگلستان سے کیمسٹری کے جدید آلات منگوا لیے ۔ اس زمانے میں کیمسٹری ہی کے شوق میں انھوں نے عربی اور عبرانی زبان بھی سیکھ لی اور علم کیمیا و سیمیا کے تجربات میں مصروف ہو گئے ؛ حصول معاش کے لیے مشن ہائی اسکول (نخاس) میں ٹیچر مقرر ہو گئے اور ٹیوشن کرنے لگے ۔

میکانکس کے شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے خاص طور پر ایک لوہار کے بیٹے کی ٹیوشن اختیار کی تاکہ دن کو اسکول اور اس کے گھر پر معلمی کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ رات کو اس کے باپ کے لوہے کے کارخانے میں تجربات کر سکیں ؛ وہاں انھوں

نے نئے نئے تجربے کیے اور کمال ذہانت سے نئے قسم کے مختلف آلات ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی۔

اسی دوران میں ایک گریجوایٹ دوست نے انگریزی زبان نہ جاننے کا طعنہ دیا اور انھوں نے نجی طور پر انگریزی کی تعلیم حاصل کرکے ایف۔اے اور بی۔اے کے امتحانات یکے بعد دیگرے پاس کر لیے؛ بعد ازاں ایک، اور ھائی اسکول میں مدرس کی حیثیت سے ملازم ھوگئے اور ایک رسالہ ''اشراق'' کے نام سے نکالا۔

اس رسالے میں زیادہ تر علم فلسفہ سے بحث کی جاتی تھی اور مختلف فلسفیانہ مضامین کے علاوہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف کے ترجمے بھی شائع ھوتے جن پر علمی بحث کی جاتی؛ اسی طرح مرزا رسوا کی مختلف النوع علمی و فنی سرگرمیاں جاری رھیں۔

جب ریڈ کرسچین کالج کا افتتاح ھوا تو وہ اس کالج میں فارسی، عربی اور فلسفہ و تاریخ کے لکچرار مقرر ھو کر درس و تدریس میں مشغول ھوگئے، اس کے ساتھ ازابیلا تھوبرن کالج (خواتین کے لیے) میں شام کو فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ اسی کالج کی ایک مغربی معلمہ سے عشق ھوا جس میں ناکامی ھونے سے مبتلائے رنج ھونا پڑا؛ انھیں دنوں ان تاثرات متالم کے تحت ایک مثنوی ''امید و بیم'' تصنیف کی جو اردو زبان میں فلسفیانہ رنگ کی پہلی مثنوی ھے۔

اسی زمانے میں علمِ ھیئت و نجوم کا شوق حد سے زیادہ ھوگیا۔ اب رسوا ھر جگہ کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر علمِ نجوم اور نظامِ شمسی کے چکر میں مبتلا ھو گئے اور شب و روز قسمت اور ستاروں کی گردش کا حساب کرتے رھے جس کے لیے ایک اسطرلاب بھی خود بنایا اور کئی آلات دُور بینیں وغیرہ تیار کر ڈالیں۔ اسی شوق میں سنسکرت بھی پڑھ ڈالی اور جدید کتب نجوم و ھیئت

کے علاوہ قدیم ترین کتابیں بھی عربی و سنسکرت کی مدد سے ان کے مطالعے سے نہ بچیں ۔ اکثر ماہرین نجوم سے بحث و مباحثہ کرتے رہے، ملک کے بڑے بڑے پنڈتوں سے ملے اور ان کے ساتھ بکسر کے مقام پر پہنچ کر سورج گرہن کا نظارہ کرکے تحقیق و تدقیق کی، ستاروں اور سیاروں کی گردش کا ایک چارٹ بھی تیار کیا جس کا نام '' زیچ مرزائی '' رکھا ۔ اسی دوران میں اپنے بعض فلسفیانہ مضامین کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں بھیج دیا، وہاں سے پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری مل گئی ۔

پروفیسر بریڈلے جو ریڈ کرسچین کالج کا پرنسپل تھا، مرزا صاحب کی علمی فضلیت اور ہمہ گیر وسیع قابلیت کا مداح و معترف تھا، اس نے بڑے اصرار سے انہیں پھر کالج میں لکچرار مقرر کرکے یہ عہدہ قبول کرنے پر مجبور کر لیا اور مرزا صاحب معلمی کے فرائض پھر انجام دینے لگے ۔

اس زمانے میں انھوں نے ایک رسالہ '' الحکم '' نکالا، یہ علمی و مذہبی پرچہ تھا جس میں مذہب اور علم فلسفہ پر گراں قدر مضامین اور مباحثے شائع ہوتے تھے: اس رسالے کے ایڈیٹر خود رسوا تھے اور نائب مدیر حکیم ممتاز حسین عثمانی تھے ۔ ریڈ کرسچین کالج کے ارباب بست و کشاد نے کامرس کی کلاسیں کھولنے پر غور و خوض کیا، اس سلسلے میں مرزا صاحب سے بھی مشورے کیے گئے اور مرزا صاحب کے مشورے سے ان کلاسوں کے ساتھ آردو شارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی شروع کی گئی: چناں چہ مرزا صاحب جو ہر شعبۂ علم و فن میں تجدید و اجتہاد کے قائل تھے، اس کام میں ایسے مصروف ہوئے کہ حکیم ممتاز حسین کی مدد سے آردو شارٹ ہینڈ ایجاد کر ڈالا اور اس کی رجسٹری حکیم عثمانی ہی کے

نام سے کرا دی تاکہ کوئی غیر شخص اس پر قابض و متصرف نہ ہو سکے اور حکیم صاحب کے لیے معاش کی ایک مستقل صورت قائم ہو سکے چناں چہ برِصغیر پاکستان و ہند میں اردو شارٹ ہینڈ کی ایجاد کا سہرا رسوا کے سر ہے جس میں رفتہ رفتہ بہت کچھ تبدیلی و ترقی عمل میں لائی گئی۔

مرزا صاحب کی گوناگوں علمی و ادبی سرگرمیاں جاری رہیں؛ جب لکھنؤ میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی بنیاد پڑی اور اس کے تحت اصلاح و بہبود کے لیے سعی و جہد کی جانے لگی تو مرزا صاحب اس تحریک کے سر برآوردہ رکن بن کر قومی اصلاح کے لیے پیش پیش نظر آنے لگے۔ وہ کانفرنس کے شعبۂ تصنیف و تالیف کے کے ناظم مقرر ہوئے اور متعدد مذہبی رسائل و کتب تالیف و ترجمہ کر ڈالیں، مختلف چھوٹی بڑی دعاؤں کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ کرکے شائع کرایا، اور ایک ضخیم کتاب ”ہدیہ سنیہ“ ۲۷، ۲۸ جلدوں میں تالیف کی، ان میں سے بیس جلدیں غیر مطبوعہ صورت میں اب تک مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے کتاب خانے میں محفوظ ہیں، بقیہ جلدوں کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں سے کتنی شائع ہوئیں؛ بہر حال اس سے رسوا کے تبحر علمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں جب عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں دارالترجمہ کھلا تو سب سے پہلے رسوا کا نام اس کے اراکین کے سلسلے میں سرِ فہرست آیا اور وہاں پہنچ کر انھوں نے شعبۂ تالیف و ترجمہ کا جو کام سنبھالا، اس کی یادگار متعدد تالیفات ہیں جن میں سے چند خاص یہ ہیں:

فلسفۂ اسلام، حکمۃ الاشراق، مبادیات علم النفس، مفتاح المنطق، کتابِ اخلاق، معاشرتی نفسیات، مفتاح الفلسفہ، جمہوریۂ افلاطون۔

حیدر آباد کے قیام کے دوران ھی میں مرزا صاحب کو فنِ موسیقی میں مہارت حاصل کرنے کا خیال پیدا ھوا اور اس فن میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ باید و شاید ؛ چناں‌چہ ھندوستانی گانوں میں مغربی موسیقی کی طرح نوٹیشن (علامات و نشانات) کی ایجاد کی اور تقریباً چار سو مختلف راگ ، راگنیوں اور گانوں کے نوٹیشن چارٹ تیار کرکے اپنی فنِ موسیقی کی ضخیم تالیف میں شامل کر دیے لیکن افسوس ناک امر یہ ھے کہ یہ مفید اور عجیب کتاب شائع نہ ھونے پائی اور غیر مطبوعہ صورت میں اس کے منتشر اوراق خدا جانے کس کس کے ھاتھ آئے اور کہاں سے کہاں پہنچے۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب کی علمی فضیلت کا اندازہ کرنا آسان نہیں ؛ متذکرہ علمی و فنی فضائل کے علاوہ اُردو ادب میں بھی ان کا مقام بہت بلند ھے لیکن مرزا صاحب نے اسے اپنے لیے ''وجۂ عزت'' نہ سمجھا اور اسی لیے ناول نگاری کا آغاز رسوا کے پردے میں کیا ورنہ اس سے پہلے شعر گوئی کے لیے مرزا تخلص کرتے تھے۔ ان کا سب سے پہلا ناول '' افشائے راز '' بتایا جاتا ھے جو نایاب ھے یا ممکن ھے اسی ناول کو ''امراؤ جان ادا'' کے نام سے شائع کرایا ھو۔ محبّی پروفیسر علی عباس حسینی کی رائے بالکل درست ھے کہ مرزا صاحب نے اپنے اور اپنے احباب کے سوانح معمولی رد و بدل کے ساتھ طشت از بام کیے ھیں مگر ھادی کے چہرے سے رسوا کا نقاب کسی موقع پر ھٹنے نہیں دیا ھے ؛ اس کی خاص وجہ یہی ھے کہ وہ ناول نویسی و فسانہ نگاری کو اپنے لیے شاعری کی طرح محض تفنن و تفریح اور اپنے مرتبے سے کم تر درجے کی چیز سمجھتے تھے۔ ان کے خاص شغف کی چیز فلسفہ ، ریاضی اور ھیئت تھی اور فلاسفۂ قدیم میں انھیں افلاطون اور ارسطو سے خاص دل‌چسپی تھی ؛ اول الذکر سے مخصوص طور سے اس لیے اور بھی کہ افلاطون

محض خشک فلسفی نہ تھا اور یہی حال مرزا صاحب کا بھی تھا کہ ان کی جوانی کے ابتدائی ایام تو بانکوں کے انداز میں گزرے ھی تھے لیکن عمر بھر فلسفہ ، علم و دانش و حکمت کی سرگرمیوں کے باوجود ان کی رنگینیٔ طبع اور شوخی مزاج نے انھیں بھی خشک فلسفی نہ بننے دیا ۔ آخر اس صاحب علم و حکمت ، فلسفی ادیب و شاعر اور عظیم فن کار نے بہ مقام حیدر آباد اکتوبر ۱۹۳۱ء میں جب کہ ان کی عمر ۷۳ سال کی تھی ، وفات پائی ۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی مدِ ظلہ نے مرزا صاحب کے ڈرامے ''طلسم اسرار'' کے دیباچے میں ان کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے بجا فرمایا ھے کہ :

'' جناب مرزا محمد ھادی بی ۔ اے مرزا و رسوا ، ماضی قریب میں ھماری قوم کے مایۂ ناز بزرگوں میں گزرے ھیں ۔ ایک طرف اگر نثر و نظم ، زبان و ادب ، شعر و انشاء کے مالک تھے تو دوسری طرف جدید و قدیم فلسفہ و معقولات کے بھی ماھر ؛ ایک عجب ھمہ گیر سا دماغ پایا جاتا تھا جس کے اندر شعر و ادب سے لے کر الٰہیات ، فلکیات ، کیمیائیات تک خدا معلوم کہاں کہاں کے خزانے شامل تھے ۔''

بلند پایہ ادیب ھونے کے علاوہ اصنافِ سخن میں انھوں نے صرف غزل اور مثنوی کو اپنے لیے مخصوص کیا ۔ رسوا فنون لطیفہ میں ڈراما سے بھی خاصی دلچسپی رکھتے ۔ تھے آردو تھیٹر کا ابتدائی ترقی کا زمانہ شروع ھو چکا تھا ، پیشہ ور پارسی کمپنیاں مضافات اودھ خصوصاً لکھنؤ میں اپنا رنگ جما رھی تھیں ، رسوا اپنے مخصوص احباب کے حلقے میں نمایاں حیثیت کے مالک اور میر محفل تھے ۔ وہ تھیٹر اور ڈرامے کے ذوق سے کیوں کر محروم رہتے ؛ چناں چہ بہ مقتضائے طبیعت و وقت متکیف ھوئے اور ڈراما نگاری کی طرف

بھی توجہ کی جس کا نتیجہ یہ ڈراما ''مرقع لیلیٰ مجنوں'' کی شکل میں موجود ہے ۔

اردو ڈرامے کی تاریخ کا آغاز اندر سبھا کی تصنیف اور تمثیل کے ساتھ واجد علی شاہی عہد میں ۱۸۵۳ء - ۱۸۵۲ء میں ہو چکا تھا اور اسی زمانے میں مشرقی بنگال کے شہر ڈھاکے میں بھی اس کی تقلید میں تھیٹر اور اردو ڈراما منصۂ شہود پر آ گیا تھا ۔ بعد ازاں بمبئی میں پارسی نوجوانوں نے گجراتی اور مرہٹی تھیٹر کے انداز پر اردو تمثیل گری کا آغاز کیا ۔ یہ جنگ آزادی کے بعد کا دور تھا لیکن اس قسم کی سرگرمیاں محض شوقیہ انداز پر جاری رہیں جو بڑھتے بڑھتے پارسی سیٹھوں کی تجارت کا جزو بن گئیں - ۱۸۸۲ء تک یہ سب کمپنیاں بمبئی اور اس کے مضافات ھی تک محدود رہیں یا زیادہ سے زیادہ حیدر آباد ، اورنگ آباد ، دکن کے علاقوں تک جا پہنچیں ؛ یہ کمپنیاں جگہ جگہ جاتیں اور اپنے عارضی منڈوے بنا کر نئے نئے کھیل دکھاتیں ۔

رسوا نے ''مرقع لیلیٰ مجنوں'' لکھا تو متذکرہ بالا تجارتی کمپنیاں موجود تھیں اور انھوں نے شمالی ہند کے دورے بھی شروع کر دیے تھے۔ ''مرقع لیلیٰ مجنوں'' کی تصنیف کا زمانہ تقریباً ۱۸۸۵ء کا ھے اور ۱۸۸۷ء میں وہ دوسری بار الہ آباد سے شائع ھوا تھا ۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۵ء تک جو تھیٹر کمپنیاں لکھنؤ میں وارد ھوئیں ، انھوں نے لکھنؤ کے رنگین مزاج تماش بینوں کو اپنا والہ و شیدا اور تھیٹر کا گرویدہ بنا لیا تھا ۔

مرزا صاحب ان پر کیف صحبتوں کا ذکر کرکے اس ڈرامے کی تصنیف کے باب میں یوں رقم طراز ھیں :

''بعض احباب — سید شہنشاہ حسین صاحب بی ۔ اے ، سید بہادر علی خان صاحب عرف ابو صاحب ، مولوی عبدالحلیم شرر—

کے اصرار سے متواتر تھیٹروں کے جلسے[1] میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ۔ یہ مذاق پہلے ہی پسند تھا ، اب دوستوں کے اصرار سے زیادہ لطف آیا ؛ تماشا کرنے والوں کی پیاری پیاری صورتیں ، اُن کے ناز و انداز ، رونا دھونا ، جان کھونا ، سب کچھ دل کو بھایا ۔ ذوق شعر و سخن بچپن سے طبیعت میں ہے ، نشو و نما ایسے شہر میں پائی ، شاعری جس کی طینت میں تھی ؛ حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں کی زبان سے سنتا ہوں ، سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی معلوم نہیں ہوتی ۔ ایک تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دھلی ، لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی ، بمبئی کے مچھلی بازار کی بول چال ہے ، یہ دساور وہیں کی ہے ''۔

اس زمانے میں بمبئی کے ڈراما نگار یہ تھے :

(۱) آرام ، (۲) الف خان حباب رام پوری (۳) منشی کریم الدین، کریم بریلوی ، (۴) جوہر بنارسی ، (۵) حکیم نظامی ، (۶) رونق بنارسی ، (۷) حسینی میاں ظریف ، (۸) طالب بنارسی ۔

چنانچہ رسوا نے جس زبان کا ذکر کیا ہے ، وہ متذکرہ بالا مصنفین ہی کی ہو سکتی ہے ۔ ان میں سے بیشتر اصحاب خوش گو شاعر اور ادیب تھے مگر ان کے لیے ڈراما نگاری کا میدان نیا تھا اور گو ان کی زبان کا تعلق بمبئی کے مچھلی بازار سے مطلق نہ تھا

۱۔ امانت لکھنؤی نے ناٹک ''اندر سبھا '' کی تصنیف و تمثیل کے لیے بھی '' جلسے '' کا لفظ استعمال کیا ہے ، نیز واجد علی شاہ کے ''رہس'' کو بھی 'جلسہ' کہا جاتا تھا ، معلوم ہوتا ہے کہ اس نسبت سے باقاعدہ تھیٹر کو بھی ابتدا میں اہل لکھنؤ جلسے کے نام سے موسوم کرتے تھے ، (عشرت)

تاهم مالکان کمپنی کی خاص فرمائش سے مجبور ہو کر انھیں اپنے ابتدائی ڈراموں میں زیادہ تر وہ بول چال استعمال کرنی پڑی جسے بمبئی کے عوام اور خود پارسی سیٹھ بخوبی سمجھ سکیں؛ چناں چہ ان کے مکالموں کی زبان میں دکن اور بمبئی کے عام محاورات رس بس گئے اور یہ تجارتی بول چال وہیں کی دساور ہوئی جسے سن کر لکھنؤ اور دھلی وغیرہ کے اہلِ زبان جس قدر ناک چڑھاتے کم تھا۔ غالباً ابتدا میں کسی کمپنی کے با ذوق صاحب علم مصنف نے اپنے مالک اور مہتمم یا ڈائرکٹر کو زبان کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا ہوگا؛ قیاس کیا جا سکتا ھے کہ یہ مصنف منشی طالب بنارسی ہوں گے جو خود راسخ دھلوی کے شاگرد اور فصیح البیان شاعر و ادیب تھے۔ اور ان ہی کے ڈرامے ''لیل و نہار'' کے مکالموں میں پہلی بار سلیس نثر کا نمونہ نظر آتا ھے۔

مرقع لیلیٰ مجنوں

رسوا کے لکھنؤ میں اس سے پہلے کئی کمپنیاں مختلف ڈراما نگاروں کے لکھے ہوئے جو ڈرامے دکھا چکی تھیں، ان میں ڈراما ''لیلیٰ مجنوں'' بھی شامل تھا جو تمام کمپنیوں کے تماشوں کی فہرست میں مشہور و مقبول رہ چکا تھا۔

مرزا صاحب سے پہلے مندرجہ ذیل ڈراما نویس ''لیلیٰ مجنوں'' پر ڈرامے لکھ چکے تھے۔

(۱) نسروان جی مہربان جی آرام ـــــــ ان کا ڈراما بمبئی میں سب سے پہلے پارسی وکٹوریہ تھیٹر کمپنی نے پیش کیا۔

(۲) منشی محمود میاں رونق ـــــــ ان کا ''لیلیٰ مجنوں'' پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے لیے ۱۸۷۷ - ۱۸۷۸ء میں لکھا گیا اور اسٹیج ہوا۔

(۳) حسینی میاں ظریف ـــــــ ان کا ڈراما لیلیٰ مجنوں

کنٹر بیونٹ کر کے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے لیے تیار کیا گیا تھا ۔

(۴) حافظ محمد عبداللہ بیگ ـــــــ انھوں نے لیلیٰ مجنوں اپنی کمپنی کے لیے لکھا اور اسٹیج کیا ۔

مرزا صاحب نے ان سب ڈراموں کو نا پسند کر کے اپنے ڈرامے کے لیے اسی پلاٹ کو خاص طور پر پسند کیا۔ ـــــــ یہ تصنیف بجائے خود ایک دلچسپ منظوم تمثیل ھے جس میں مثنوی کا عام انداز یا اس دور کے غنائیہ ناٹک کی طرز مخصوص نمایاں ھے لیکن اسے کسی کمپنی نے اپنے تجارتی اسٹیج کے لیے قبول نہ کیا جس کی وجوہ حسب ذیل قرار دی جا سکتی ھیں ۔

(۱) اس ڈرامے کی زبان فصیح و بلیغ شاعرانہ تھی جسے مالکان کمپنی نے اپنی مروجہ روش کے خلاف سمجھا ۔

(۲) تدبیر کاری کا انداز اس دور کے ڈراموں سے کسی قدر مختلف تھا ؛ چنانچہ اسے اسٹیج کے منافی سمجھا گیا ۔

(۳) پلاٹ مشہور و معروف کہانی کا تھا ۔ اس موضوع پر کئی عامیانہ ڈرامے موجود تھے جو وقت کی ضرورت اور اسٹیج کے تقاضوں کو بدرجۂ احسن پورا کرتے تھے اور عام مقبولیت و شہرت کے مالک تھے؛ ان کی جگہ کسی نئے ڈرامے کو تجربے کے لیے پیش کرنا نامناسب اور خطرناک سمجھا گیا ۔

(۴) محض اصلاح زبان کے خیال سے کسی نئے ڈرامے کو پیش کرنا (اور وہ بھی عام مشہور ڈرامے کی جگہ)

ہر کمپنی کے لیے اس وقت خلاف مصلحت اور
خطرناک تھا ۔

چنانچہ رسوا کی سعیٔ نامشکور پروان نہ چڑھی اور شاید
اسی ناقدردانی کے سبب انھوں نے پھر کوئی ڈراما نہیں لکھا ۔
یہی کیفیت مولانا شرر لکھنؤی کے دو ڈراموں کی ہوئی جو اس
وقت کے اسٹیج کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکنے کے سبب
گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے ۔

''مرقع لیلیٰ مجنوں''۔ یہ ڈراما زبان کی فصاحت و بلاغت
کے لحاظ سے یقیناً اپنے دور کی ایک قابل مطالعہ تصنیف ہے اور
شعری ادب میں ایک 'مثنوی' یا منظوم کہانی کی حیثیت سے بھی
دلکش اضافہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن کسی سپاٹ کہانی کو صرف
مکالمہ نویسی سے اسٹیج پر کامیابی نہیں ہو سکتی اور رسوا نے اس
ڈرامے میں فنی لوازم اور تدبیر کاری کو ملحوظ نہ رکھا اس لیے
اسے فن کا ترقی یافتہ نمونہ نہیں کہا جا سکتا ۔ ان کے معاصرین
مولانا عبدالحلیم شرر، شوق قدوائی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور
مولانا ظفر علی خاں وغیرہم نے بھی اسی نوع کے ڈرامے لکھے؛
چناں چہ محمد عزیز مرزا ناظر لکھنؤی نے کالیداس کے ڈرامے
'وکرم اروسی' کے ترجمے میں (اپنی تمہید میں) 'مرقع لیلیٰ مجنوں'
کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے
کہ اس ڈرامے سے محض علم ادب میں اضافہ ہوا ہے، فن میں
نہیں ۔ وہ لکھتے ہیں ''پارسیوں کی اولوالعزمی کی بدولت یا ان کی
دیکھا دیکھی چند ناٹک ہماری زبان میں موجود ہو گئے ہیں
مگر وہ عموماً ایسے لوگوں کی تصنیف سے ہیں جو نہ اپنی زبان
سے اچھی طرح واقف ہیں اور نہ دوسری زبانوں سے اور فن شعر یا
ڈرامے کے اصولوں سے تو محض نابلد ہی ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے

که ابھی تک ہماری زبان میں سوائے ' مرقع لیلیٰ مجنوں' یا چند انگریزی ناٹکوں کے ترجموں کے ایک ڈراما بھی ایسا نہیں ہے جس سے علم ادب میں ذرا بھی اضافہ ہوا ہو''۔

عزیز مرزا خود فن ڈراما میں معقول درک رکھتے تھے اور اس دور کے موجودہ ڈراموں کو قابل اعتنا نہ سمجھتے تھے یہاں تک کہ حق دوستی ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے انصاف و دیانت کا خون گوارا نہیں کیا اور مرزا رسوا کو بھی دبی زبان سے ''فن ڈراما'' کے اصولوں سے نا بلد ھی قرار دیا اور اسے ایک ادبی تصنیف سے زیادہ اھمیت نہیں دی۔

متن کی نسبت زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، قارئین خود ھی ملاحظہ کریں گے البتہ چند اشارات کی مختصر تشریح ضروری معلوم ہوتی ھے جس سے اصل مطالعے میں آسانی ہوگی۔ فاضل مصنف نے جا بجا حواشی میں نوٹ درج کیے ھیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ھے:

(۱) جیسا کہ مرزا صاحب نے کتاب کی تمہید میں خود لکھا ھے، ڈرامے کے مکالموں میں موقع بہ موقع مختلف بحریں استعمال کی ھیں اور حواشی میں ھر بحر پر توضیحی نوٹ لکھ دیا ھے؛ ابتدا میں لکھنؤ کی زبان پر تفصیلی تبصرہ بھی کیا ھے۔

(۲) جس مکالمے میں جو بحر استعمال کی گئی ھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ' قصد شاعر' کے عنوان سے اس نظم کا مقصد بھی بیان کیا گیا ھے۔

(۳) جہاں کہیں شاعر نے کسی مکالمے میں محسوس کیا ھے کہ یہاں ' ابہام' یا ' اغلاق' ھے، وھاں حاشیے میں ان نکات کی تشریح کے لیے نوٹ لکھ دیا ھے تاکہ عام

ناظرین اس کا مفہوم بخوبی سمجھ سکیں ۔

ایک امر خصوصیت سے مد نظر رکھنا چاہیے کہ مصنف نے اکثر مقامات پر کسی اداکار کے مکالمے کے دوران میں ہدایت لکھی ھے کہ یہ مکالمہ ''دل میں'' ادا ھوتا ھے ؛ اس ''دل میں'' سے ان کی مراد ھے ''سائڈ میں'' یا ''آھستہ سے'' ، گویا وہ بات علٰحدہ طور پر اس طرح ادا ھوتی ھو کہ مخاطب یا دوسرا کردار نہ سن سکے ، صرف 'تماشائی' یا قارئین کو سنانا مقصود ھے ۔ ڈرامائی عمل میں یہ ترکیب عام ھے جو ''سائڈ میں (ASIDE)'' یا ''علٰحدہ'' کہلاتی ھے ۔ چونکہ مصنف کو فنی اصولوں پر عبور نہیں اس لیے انھوں نے اس اصطلاح کو ''دل میں'' کہا ھے اور اس پر غور نہیں کیا کہ ''دل میں'' کہی ھوئی بات کسی کے گوش گزار نہیں ھو سکتی ؛ یہ 'ناول نویسی' کی ترکیب ھے اور رسوا کی ڈراما نگاری کا سارا عمل بھی 'ناول نویسی' کے انداز پر ھے ۔

پلاٹ ''لیلٰی مجنوں'' کی مشہور داستان معاشقہ پر مبنی ھے جو ایک دردناک المیہ ھے لیکن افراد قصہ میں مصنف نے اصلیت سے گریز اختیار کیا ھے اور اصل کردار یعنی 'لیلٰی اور قیس' اور ان کے خاندان کو مسلمان بنا دیا ھے حالاں کہ اس معروف داستان کا عہد وقوع 'قبل از اسلام' بتایا گیا ھے اور ان افراد کے مشرف بہ اسلام ھو جانے سے پلاٹ کی بنیادی حیثیت یا ڈرامائی عمل میں کوئی خاص اھمیت یا کشش پیدا نہیں ھوتی ۔ ممکن ھے مصنف کے خیال میں 'قیس و لیلٰی' کے مسلمان ھونے سے عام شائقین (جو اس وقت زیادہ تر مسلمان طبقے سے ھی ھوتے تھے) کو ان سے زیادہ ھمدردی پیدا ھونے کا امکان تھا اور اس طرح ڈراما (اگر اسٹیج کیا جاتا) زیادہ مقبول و مشہور ھوتا

لیکن یہ امر چنداں قابل قبول نہیں کیوں کہ ایک مسلمہ حقیقت کو مسخ کرنا متحسن نہیں اور ناول یا کہانی میں کوئی زور یا اثر پیدا نہیں کر سکتا ہے ؛ غالباً رسوا نے 'بطور خود' ڈراما نگاری کی صنف میں جو اجتہادی قدم اٹھایا تھا ، یہ تبدیلی بھی اس نہج کی ایک کڑی ہو گی ۔ پلاٹ کے سلسلے میں ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ مصنف اپنے انداز بیان اور تدبیر کاری کے ذریعے اس ڈرامے میں وہ فضا اور ماحول قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے جو اس قسم کے تاریخی یا نیم تاریخی قصے میں خصوصیت سے ہونا چاہیے ۔

مرزا صاحب کے اضافی کردار طرار ، زہرہ اور خیلا وہ عام پیشہ ور افراد ہیں جو ان کے عہد کے چوک بازار (لکھنؤ) کے بالا خانوں پر پائے جاتے تھے ؛ ان سب کی بود و باش ، حرکات و سکنات اور بول چال لکھنؤ کی طوائفیت کے عامیانہ انداز میں ہیں ، سر زمین عرب (جس سے اس قصے کا تعلق ہے) سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں ، نہ اس فضا میں وہ سانس لیتے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور نہ وہاں اس قماش کے لوگ پائے جاتے تھے ۔ بہر حال اس قسم کی عام کیفیت اس ڈرامے میں پائی جاتی ہے اور اس کا خاص سبب وہی ہے کہ رسوا در اصل محض ایک شاعر اور افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں ۔

بہ حیثیت مجموعی اس تصنیف میں شاعرانہ خوبیاں اور اسلوبِ بیان کی دلکشی بدرجۂ اتم موجود ہے اور مطالعے کی غرض سے ایک دلچسپ ، لطیف و قابل دید چیز ہے ۔ یہ ڈراما ۱۸۸۵ء کے لگ بھگ لکھا گیا ہو گا اور جو تھیٹریکل کمپنیاں لکھنؤ آتی رہی تھیں غالباً ان میں سے اکثر کے سامنے اسے پیش کیا گیا ہوگا ۔ اس کا پہلا ایڈیشن لکھنؤ میں شائع ہوا اور دوسرا اڈیشن الہ آباد میں لالہ رام نرائن لال (پبلشر) کے اہتمام سے اول اڈیشن سے بہتر

انداز میں چھاپا گیا ؛ دونوں اڈیشنوں کی طباعت کے سن درج نہیں ، صرف مصنف موصوف نے تمہید میں دسمبر ۱۸۹۷ء درج کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہید اس وقت لکھی گئی ہو گی جب یہ ڈراما اسٹیج کے لیے نا مطبوع قرار پایا اور اس کا پہلا اڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہونے لگا ۔ طبع اول و ثانی کے حواشی میں کچھ فرق ہے ؛ طبع ثانی میں اول کے مقابلے سے اضافہ ہوا ہے ، میں نے دونوں کی مطابقت سے موجودہ نسخے کو مکمل صورت میں پیش کیا ہے اور ہر ممکن صحت کا لحاظ رکھا ہے ۔ باقی خصوصیات کا اندازہ قارئین کے ذوقِ سلیم کے سپرد ہے ۔

لاہور — عشرت رحمانی

۲۵ - اپریل ۱۹۵۹ء

تمہید

از

مرزا محمد ہادی رسوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

یا مصوّر![1] جلّ شانہ

ہے[2] مصوّر سے یہ ایما دیدۂ تصویر کا
کور ہے منکر تری رنگینئی تحریر کا

اے[3] بار الٰہ ! زبان میں اثر دے ، اپنے سائل کا منہ موتیوں سے بھر دے ! سحر بیانی عطا کر ، سیف زبانی عطا کر ! ۔ اگلے سال ایک مثنوی سنا چکا ہوں ، ''نوبہار[4]'' کا سماں دکھا چکا ہوں ؛ امسال کچھ اور ہی دھن سمائی ہے ، ایک نئی بات دل میں آئی ہے ۔ جی چاہتا ہے کہ لیلیٰ مجنوں کے افسانے کو مرقّع بناؤں ، نجد کے کوچہ و بازار ، دشت و کوہسار کے نقشے کھینچوں ، حسن و عشق کی خیالی تصویریں آنکھوں سے دکھاؤں ۔ ناظرین کے دل سے آہ نکلے ، زبان سے واہ نکلے ۔

۱- ''مصوّر'' اسمائے صفات باری تعالےٰ عز اسمہ' سے ہے ۔
۲- صنف کلام : مطلع غزل ، بحر : رمل وافی محذوف ۔ وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن ، فاعلن دوبار ۔ قصد شاعر : حمد میں تالیف مرقع کے تلازمے کو دخل دینا ۔
۳- صنف کلام : نثر مقفّیٰ ۔ قصد شاعر : مناجات بہ تلازمۂ شعر و مرقع ۔
۴- ''نوبہار'' مرزا رسوا کی ایک مثنوی ہے جو اس ڈرامے کی تصنیف سے ایک برس پہلے لکھی گئی ۔ (عشرت)

یہ سچ[۱] ہے کہ اگلے رنگ اڑا لے گئے ، ہر چیز کا مزا لے گئے مگر ہمیشہ بہار ہے ، وہی گل ہے ، وہی گلزار ہے ؛ اس مے خانے میں کون کب محروم رہا ہے ، جس مست کو دیکھو ، آج بھی جھوم رہا ہے ۔

انسان کی طبیعت ہزار ہا برس میں نہیں بدلتی ، جو بات روز اول سے کان میں پھونک دی گئی ہے ، دل سے نہیں نکلتی ۔ وہی کھانا ہے ، وہی پینا ہے ، وہی مرنا ہے ، وہی جینا ہے ؛ وہی عشق ، وہی عاشقی ، وہی لطف ، وہی دل لگی ؛ وہی آہِ سرد ، وہی نالۂ پُر درد ؛ وہی دل ، وہی دماغ ، وہی جگر ، وہی داغ ؛ وہی نفاق ، وہی اتفاق ، وہی وصال ، وہی فراق : وہی معشوقوں کی بے وفائی ، وہی جذب دل کی نارسائی ؛ وہی جلادوں کی چھری تیز ، وہی نظر وہی غمزۂ خوں ریز ؛ وہی سوز، وہی ساز ، وہی راز ، وہی نیاز ؛ وہی ساقی ، وہی پیمانہ ، وہی شراب ، وہی خم خانہ ۔ غرض کہ ہر بات وہی ہے ، دن وہی رات وہی ہے ۔ اگر کوئی کہے کہ کچھ فرق تا معلوم سا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ معدوم سا ہے ۔ اگرچہ[۲] امور ظاہر میں کچھ تفاوت نظر آتا ہے مگر احوال باطن اور کیفیات ذہنی میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا ۔ بے شک انسان میں ایجاد کا مادہ پیدا کیا گیا ہے ، نئے نئے تماشوں پر اس کا دل شیدا کیا گیا ہے مگر اپنے مزاج کی تجدید پر مختار نہیں ؛ سرحد ادراک سے آگے جانا اس کی طاقت سے باہر ہے ۔ کیا مجال ایک قدم

۱- بیان وجہ تالیف مرقع ہذا شروع ہوتا ہے ، اس کا ذکر منظور ہے کہ طبیعت انسانی ہمیشہ ایک ہی وتیرے پر رہتی ہے ۔
۲- یہاں سے نثر میں قافیے کی قید کو ترک کیا ہے ۔ انسان کی حالت بہ اعتبار جبر و اختیار کے بیان کی جاتی ہے ۔

آگے بڑھا سکے ؛ البتہ انسان بالکل مجبور نہیں ، کچھ کر سکتا ہے ، کچھ اٹھا سکتا ہے ، کچھ دھر سکتا ہے ، مگر اتنے سے اختیار پر نازاں نہ ہونا چاہیے ؛ جو دوڑ کر چلے گا ، گر پڑے گا ، جتنا بنے گا اتنا ہی بگڑے گا ۔ یہ تو سمجھو کہ ہم کیا ہیں ، کیا نہیں ، آخر انسان ہیں ، خدا نہیں ۔

ہمارے[1] بعض احباب نے اہل یورپ کی شاعری پر توجہ فرمائی ہے ، اپنی زبان کو بگاڑ کر ایک نئی چیز بنائی ہے ۔ بڑی بڑی انشا پردازیاں ہوتی ہیں ، خوب خوب سحر سازیاں ہوتی ہیں ۔ کوئی صاحب ہندی کی چندی لکھنے پر فریفتہ ہیں ، کوئی صاحب انگریزی قصّوں کے لفظی ترجمے پر غش ہیں ۔ ہم بار بار کہہ چکے ہیں ، افراط و تفریط ہر صورت میں ناجائز ہے ۔

۱۔ قریب پچاس برس کے گزرے ہوں گے کہ ہمارے ملک میں ترمیم و اصلاح کا چرچا شروع ہوا ہے ۔ ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو ملک اور قوم کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا ہے ۔ ہم دردیٔ قومی کا نام ہر ایک شائستہ جلسے میں کئی بار لیا جاتا ہے ۔ جہاں دیکھو ترمیم کی فکر ہے ۔ کوئی صاحب ترک خیالات مذہبی کی قسم کھائے ہوئے ہیں ، کہیں اصلاح طرز معاشرت کا ذکر ہے ، کہیں اردو زبان کی ترمیم کا خیال ہے ۔ ایک صاحب اردو زبان کی ترقی سے مایوس ہو کر صلاح دیتے ہیں کہ اس زبان کو قطعاً ترک کر دینا چاہیے ، اَور کوئی زبان ، زبان ہائے یورپ سے اختیار کرنا چاہیے ، خصوصاً انگریزی ؛ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب خود انگریزی اور نہ کوئی اَور زبان زبان ہائے یورپ سے جانتے ہیں (فاعتبروا یا اولی الابصار) ۔ مصنف کا خیال ہے کہ ملک کی ترقی کے ساتھ زبان کی ترقی یا تنزلی جو سمجھو ، خود ہی ہوتی جائے گی ۔ ہمارا تمھارا کام نہیں ہے کہ زبان کی ترقی کریں ۔ ہماری یہ کوشش ہونا چاہیے کہ جس زبان میں ہمارے ملک کے شرفا گفتگو کرتے ہوں ، اسی کو تحریر و تقریر میں اختیار کریں ۔

اعتدال سے کام لو ؛ زبان کی اصلاح ایک شخص کا کام نہیں ، جو کچھ آپ سے ہو جائے ، اُسے ہونے دو ، اپنی طرف سے نہ بناؤ نہ بگاڑو ؛ آئندہ اختیار ہے ، قلم تمھارے ہاتھ میں ہے ۔ اہل اخبار خشک و تر جو کچھ مل جائے ، اُس کے چھاپ دینے کی قسم کھائے ہوئے ہیں ۔ بعد تصنیف رسالہ ''استشعار[1] فی توجیہ الاشعار'' جس

۱۔ رسالہ '' استشعار فی توجیہ الاشعار '' جس کا مختصر اور عام فہم نام '' شگوفہ (بلاغت) '' رکھا گیا ہے ، تصنیف ہو چکا ہے ، آج کل اس پر نظر ثانی ہو رہی ہے ۔ اس کتاب میں علم نفس کی رو سے شاعرانہ تخیل پر نظر کی ہے ۔ تمہید کتاب میں شاعری اور فلسفے کے تعلقات کا ذکر کیا ہے ، پھر شعر گوئی اور شعر فہمی کی توجیہ کی ہے ۔

باب اول میں شعر کا تعلق فلسفۂ نفس سے بیان کیا گیا ہے ؛ اس باب میں قوائے ذہنیہ کی تشریح ایک مختصر مگر واضح طور سے بیان کی ہے ۔ تخیل جس کو شعر سے تعلق ہے ، ایک علاحدہ فصل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ ایک فصل میں حواس و محسوس اور مسئلۂ لذت و الم کو ذکر کیا ہے ۔ افلاطون کا مذہب اس باب میں بیان کیا ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے ۔

باب دوم میں کیفیات ذہنیہ کو بیان کیا ہے ، پھر کیفیات ذہنیہ کی تقسیم بیان کی ہے ۔

باب سوم تخیل ماذج کے بیان میں ہے ۔ تخیل ماذج وہ تخیل ہے جو مداخلت قوت فکری سے مبرّا ہو ۔ مضامین شعری میں یہ تخیل نہایت موثر ہے مگر اس پر آج تک کبھی نظر نہیں گئی ۔ تخیل ماذج کی تشریح میں بہت سی کیفیات ذہنیہ کو بیان کیا ہے اور اُن کی مثالیں اُستادوں کے کلام سے پیش کی ہیں ۔

باب چہارم میں تخیل مرکب کو بیان کیا ہے ؛ اس باب میں علم بیان کو ایک جدید طریقے سے حل کیا ہے ۔

باب پنجم اقسام شعر کے ذکر میں ہے ۔ اس باب میں کئی اعتباروں سے مضامین شعریہ اور نظم و نثر کے اصناف کو بیان کیا ہے ۔ خاتمۂ کتاب میں اور بعض امور متعلق شعر بیان کیے ہیں ۔

کا چھوٹا سا نام ''شگوفہ (بلاغت)'' ہے، جی چاہتا تھا کہ اب ایک ایسی کتاب نظم و نثر میں تحریر کروں جس میں اکثر اصنافِ شعر شامل ہوں تاکہ متعدد کیفیات ذھنیہ کا مختلف طور سے بیان ہوجائے - از بس کہ طرا غود[1] یا بہ قول اکثر حکما اجود اصناف شعر سے ہے، اور اس میں کل اور قسمیں شامل ہو سکتی ہیں، لہذا اسی کو تجویز کیا - اب یہ خیال تھا کہ کون سا قصۂ پُر غم اور واقعۂ ماتم و الم لکھوں جو عموماً طبائع اهل هند کو مرغوب ہو - ''الف لیلہ'' الٹ پلٹ کے دیکھتا تھا کہ انھیں دنوں میں بعض احباب[2] کے اصرار سے متواتر تھیٹر کے جلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہؤا - یہ مذاق پہلے بھی پسند تھا، اب کے دوستوں کے اصرار سے زیادہ لطف آیا - تماشا کرنے والوں کی پیاری پیاری صورتیں، اُن کا ناز و انداز، رونا دھونا، جان کھونا سب کچھ دل کو بھایا مگر لب و لہجہ روزمرہ پسند نہ آیا - یہ دل بے قرار جہاں جاتا ہے، ایک نئی بات سمجھاتا ہے - ذوق شعر و سخن بچپن سے طبیعت میں ہے، نشو و نما ایسے شہر میں پائی، شاعری جس کی طینت میں ہے - حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں کی زبانی سنتا ہوں - سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی نہیں معلوم ہوتی - ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دھلی لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، بمبئی کے مچھلی بازار کی بول چال ہے، یہ دساور وھیں کی ہے، وھیں کا مال ہے- میں نے دل میں کہا

۱- ''طرا غودیا'' وہ قصہ جس کا انجام غم پر ہو، دیکھو فرھنگ -

۲- احباب: سید شھنشاہ حسین صاحب رضوی بی اے، سید بہادر علی خاں عرف ابو صاحب اور مولوی عبدالحلیم صاحب شرر-

شکر ہے کہ اس مہملات کو ہماری[1] زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ذوق سخن سرائی نے صلاح دی کہ تو بھی انھیں متعارف قصّوں سے کوئی قصّہ لے کر مرقع بنا۔ دوستوں کو جو اس قصد کی اطلاع ہوئی، مجھ کو اور بھی دیوانہ بنایا، اصرار کو حد سے بڑھایا کہ اگر قصد ہے تو پھر دیر کیا ہے۔ آج کل تم کو فرصت ہے، جو دم ہے، غنیمت ہے؛ خدا جانے کہاں جانا ہو، کہاں رہنا ہو، یہ جوش رہے یا نہ رہے، یہ شوق رہے یا نہ رہے۔ حسن و عشق کے قصوں میں لیلیٰ مجنوں کا افسانہ (جس کو تاریخی واقعے کی وقعت حاصل ہے)، عموماً مشرقی طبائع کو مرغوب ہے، واقعی بہت خوب ہے۔ دل نے اسی کو اختیار کیا، چند نمائشیں کہہ کر حضرت استادی و مکرمی جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج (مدّظلہ العالی) کی خدمت میں لے جا کے سنائیں

۱- ہم لکھنؤ والوں کو جس زبان پر اس قدر ناز ہے، اگر سچ پوچھو تو وہ فی الحقیقت دھلی ھی کی زبان ہے، اس لیے کہ لکھنؤ میں جن لوگوں کی زبان قابل اعتبار ہے اُن کے آبا و اجداد اوّلاً دھلی سے فیض آباد میں اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آ کر آباد ہوئے۔
سب کو جانے دو، وہ خاندان جو ایک مدت تک سرزمین اودھ پر کار فرما رہا، دھلی کے معزز اور نام بر آوردہ نوابوں میں سے ایک نواب کی اولاد ہے۔

ان نوآباد لکھنؤ والوں نے مثل اُور جائداد کے زبان بھی اپنی اولاد کو ورثے میں دی۔ ان لوگوں کی اولاد کے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے وطن کی زبان کا تا حد امکان تحفظ کیا بلکہ اس میں کسی قدر ترقی بھی کی جس کو اہل دھلی نے اکثر وجوہ سے تسلیم بھی کیا۔

سرزمین لکھنؤ کے اصلی باشندے اکثر شیخ زادے یا باج پیٹی برھمن ھیں۔ ان لوگوں کی وہ زبان تھی جو آج تک لکھنؤ کے اطراف و جوار میں بولی جاتی ہے جس کو لکھنؤ والے گنواری یا پوربی زبان کہتے ھیں۔ لکھنؤ کے ان اصلی اور قدیمی باشندوں کو اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷ پر)

بعد حکّ و اصلاح ارشاد فرمایا ''مناسب ہے کہ تمام بحور مرقع میں آجائیں تا کہ مبتدی موزوں طبعوں کو مفید تر ہو'' تعمیل حکم حضرت استاد کو عین سعادت سمجھ کے اس پر بھی کاربند ہؤا ، اور اس کے ساتھ ھی یہ بھی خیال رہا ہے کہ ہر ایک بحر کا نظم موسیقی موافق اس حالت کے ہو جس حالت کا اظہار شعر سے مطلوب ہے اور یہ امر اہل ذوق و استشعار سے پوشیدہ نہ رہے گا۔

قیس کے دیوان (جس کا مدوّن والبی ہے) کے مدوّن نے یہ تکلف کیا ہے کہ ہر ایک غزل کے پیشتر اس موقع اور روداد کو بھی بیان کردیا ہے جہاں پر اس غزل کا انشاء واقع ہوا۔ یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

حسب و نسب کے تحفظ کا حد سے زیادہ خیال ہے اور اب بھی وہی دستور ہے۔ یہ لوگ سوائے اپنے خاندان کے اور کسی اچھے خاندان سے خواہ وہ کیسا ھی معزز اور شریف کیوں نہ ہو ، تعلق نسبتی نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ تمام ہندوستان کے شریف دہقانوں کا یہی دستور ہے۔ مشہور ہے کہ کسی نواب اودھ نے اپنے یا اپنی اولاد کے لیے ایسا چاہا تھا مگر شیخ زادوں نے منظور نہیں کیا۔ اس اجتناب و احتراز کی وجہ سے اگرچہ ان لوگوں کے مردوں کی زبان تو دہلی والوں کے ساتھ میل جول کرنے کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی مگر مستورات کی زبان میں بہت کم فرق آیا۔ بچوں کی زبان میں ماں کی زبان کا کچھ اثر ضرور ہونا چاہیے ، اس لیے ان کے مردوں کے لہجے میں بھی آج تک فرق پایا جاتا ہے۔ دہلی والوں کی اولاد جو لکھنؤ میں آباد ہے ، ان کی شادی بیاہ کی رسمیں بھی لکھنؤ کے قدیم باشندوں کے رسوم سے بالکل مختلف ہیں۔ پس لکھنؤ میں دو قسم کے باشندے سکونت پذیر ہیں؛ ایک وہ جن کو دہلی سے تعلق ہے ، دوسرے وہ جن کو نہیں ہے۔ پہلی قسم کے باشندے سوائے اپنے خاندان کے اور شریفوں میں بھی شادی بیاہ کرنے سے مضائقہ نہیں کرتے؛ دوسرے وہ جو صرف اپنی برادری میں نسبت ناطہ کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں نے ان لوگوں سے ایسا تعلق نہ کیا تو وہ مجبور تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸ پر)

دیوان بجائے خود ایک تاریخ قیس کی سوانح عمری کی معلوم ہوتی ہے ، گو کہ اُس میں شاعرانہ مذاق کو بہت کچھ دخل دیا گیا ہو - میں ان واقعات کو کلیۃً اختیار نہ کرنے پر مجبور ہوا ، اس لیے کہ اکثر مضامین اس دیوان میں ایسے ہیں جو ہمارے ملک اور نیز فارس کے شاعرانہ مذاق کے بالکل مخالف ہیں ، پھر بھی تاحدِّ امکان اکثر واقعات اُسی دیوان سے لیے ہیں ؛ نمائش ہر ایک روداد کی گویا کہ ہندوستان میں رکھی گئی ہے تا کہ ہم وطن مسلمانوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
کہ اپنی وطن شریف دہلی والوں سے جو ان کے ساتھ یا پیش‌تر یا بعد وہاں سے آئے تھے ، اس قسم کا تعلق کرتے ؛ اس وجہ سے ان کی اصلی زبان کا تحفظ ہوا - ان لوگوں کی مرد عورت دونوں کی زبان حقیقت میں دہلی کی زبان ہے اور دوسرے قسم کے باشندوں کی زبان اردو پوربی آمیز ہے جس کو قصباتی زبان کہتے ہیں ؛ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ جو لوگ مدت سے لکھنؤ میں سکونت پذیز ہیں ، اُن کے مردوں کی زبان میں پوربی کی آمیزش بہت کم ہے مگر پھر بھی اپنی اصلی زبان کے ایک دو لفظ بول جاتے ہیں - اگر اس کا بھی بہت تحفظ کیا ہے تو لب و لہجے میں امتیاز ضرور ہے - پس اس قسم کے باشندے کی زبان مادری دہقانی ہے اور اول قسم کے باشندوں کی مادری و پدری اردو ہے ؛ اردوئے معلّیٰ نہیں کہتا اس لیے کہ دہلی والے برا نہ مانیں لیکن بہ قول غالب مرحوم کے یہ بھی کہوں گا کہ جب اردو بازار نہ رہا تو اردوے معلّیٰ کیسی - اگر اردوئے معلّیٰ اس زبان سے مراد ہے کہ جو غالب مرحوم کے زمانے میں یا اس سے پیشتر دہلی میں بولی جاتی تھی ، تو وہ اب نہ دہلی میں ہے نہ لکھنؤ میں -

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں آج جو کچھ فرق ہے ، اُس کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معیار موجود نہیں ہوا ہے ، اس لیے کہ دونوں شہروں کے شعرائے متاخرین کو ہم اپنا پیشوا بنائیں اور اُن کی پیروی کو اپنا فخر سمجھیں ، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رسم و رواج اور مرور ایام کی وجہ سے جو الفاظ اور محاورات ہماری زبان میں گھل مل گئی یا متروک ہوجائیں ، ان کو اختیار یا ترک کریں ؛ ایسا ہی اب تک ہوا ہے اور یہی ہوگا ، فتاملّ -

کے طرز معاشرت کو کسی نہ کسی پیرائے سے بیان کرنے کا موقع ملے ۔ جو واقعات قیس کے ہیں ، اُس کو اصلی جوش و خروش کے ساتھ وہی بیان کر سکتا ہے جس کے دل پر گزری ہو ۔ ہم نے قیس کے نفس کو اپنی ذات پر قیاس کر کے جو چاہا لکھا ، ہم اس غریب کو کیا جانیں مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے نفس پر کسی ایسی ہی حالت میں گزرتا ہے ، کچھ ایسا ہے یا اس سے کم یا زیادہ اس پر بھی گزرا ہوگا ۔ ؎

جب کیا مجنوں کی تصویر خیالی کا خیال
لے لیا بہزاد نے خاکہ مری تصویر کا

اس کتاب کے حاشیے پر بحر اور وزن شعر کے سوا اَور اَور باتیں بھی جو میرے دل میں آئیں ، لکھ دیں ؛ عجب نہیں ہے کہ ناظرین کو مفید ہوں ۔ مصنف کے لیے شاید یہ فخر بجا ہو کہ یہ پہلا مرقع ہے جو مسلّم الثّبوت شعرائے دھلی و لکھنؤ کی زبان میں کچھ کہنے کے قصد سے لکھا گیا ہے ۔ رہا یہ امر کہ میں کس حد تک اس کوشش میں کامیاب ہؤا ، یا بالکل نہ ہؤا ، ناظرین کے انصاف پر موقوف ہے ۔

کس طرح وہ سمجھیں گے الٰہی مرے دل کی
ہے میری زباں اَور فرشتوں کی زباں اَور

لکھنؤ ۔ دسمبر ۱۸۸۷ء — مرزا محمد ھادی

مرقع

لیلیٰ مجنوں

مؤلفہ : مرزا محمد ہادی رسوا
مرتبہ : عشرت رحمانی

افرادِ قصّہ

لیلٰی	:
مجنوں	:
عبد اللہ	: مجنوں کا باپ ۔
عبد العزیز	: لیلٰی کا باپ ۔
بیگم	: لیلٰی کی ماں ۔
طرّار	: مجنوں کا ہم مکتب ، ایک آوارہ مزاج لڑکا ۔
خون خوار	: طرار کا باپ ۔
خیلا	: لیلٰی کی ہم مکتب ، ایک طوائف زادی ۔
نوھرہ ڈومنی	: طوائف ، خیلا کی ماں ۔
مولوی عشق الدین	: لیلٰی اور مجنوں کا آخوند ، ایک پرانی وضع کا مولوی ۔
کاہن	: مجنوں کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے والا ایک نجومی ۔
نوفل	: سلطان روم ۔
وزیر	: نوفل کا وزیر ۔
پیر زن	: مجنوں سے بھیک منگوانے والی بڑھیا ۔
کلوار	: مے فروش ۔
دایہ	: مجنوں کی خدمت گارِ خاص ۔
محل دار	: عبداللہ کے محل کی انچارج ۔

خدمت گار ، نوکر ، خواصیں ، لونڈیاں ، ڈومنیاں ، مکتب کے لڑکے لڑکیاں ، راہ گیر ، باغبان اور دوسرے ۔

مقام	: وادیٔ نجد

مرقّع[1] لیلیٰ مجنوں

عنوان[2]

بہت سے لوگ آ کے گاتے ہیں

ترانہ

یہ لطف جہاں کے کم نہ ہوں گے اے دل!
کس دن یہ غم و الم نہ ہوں گے اے دل!

مے پی، شب مہتاب میں خانہ خراب
مہتاب تو ہوگا ہم نہ ہوں گے اے دل!

ساقی نامہ

بہار[3] آئی ہے اے ساقی! شرابِ روح پرور دے
مہک پھولوں کی جس ساغر سے آتی ہے وہ ساغر دے

وہ ساغر دے کہ جس سے بوئے مستِ یار آتی ہو
وہ صہبا دے کہ جو دل کو سرورِ وصلِ دلبر دے

۱- یعنی تصویروں کی کتاب جس کو انگریزی میں البم کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح مصوروں کی ہے۔ مناسبت اس لفظ کی ڈراما (ہندی ناٹک) کے ساتھ ظاہر ہے۔

۲- سرنامہ جس کو انگریزی میں "فرنٹس پیس" (Frontsepiece) کہتے ہیں۔ وہ تصویر جو کسی کتاب کے ابتدا میں لگا دیتے ہیں۔

۳- اس غزل میں قصد شاعر یہ ہے کہ بعض استعارات اور تشبیہات شراب کا ذکر کرے۔ یہ سب استعارے اور تشبیہیں اہل فارس کے کلام میں موجود ہیں۔ پہلا شعر غزل کا مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں طرف قافیے اور ردیف پر یا صرف قافیے پر ختم ہوں۔

عجب عالم ہے گلشن میں فضائے سبزہ و گل سے
کوئی جام زمرّد گوہرِ یاقوت سے بھر دے

چمن میں صبح کو اٹھتے ہیں شعلے آتشِ گل سے
صبوحی کے لیے ہم کو بھی ساقی آتشِ تر دے

کیا ہے سبز کیا کیا فصلِ گل نے زرد پتوں کو
دوائے زردیٔ رُخ کے لیے تو آبِ احمر دے

لہو کی بوند بھی اب چشمِ لاغر میں نہیں باقی
علاجِ ناتوانی کے لیے خونِ کبوتر دے

گھٹا گھنگھور چھائی ہے، جھما جھم مینہ برستا ہے
لبالب آج اے ساقی! پیالے بھر کے ساغر دے

ہوائے سرد چلتی ہے، عجب لطفِ برودت ہے
ہمیں بھی آتشِ سیّال سے تو آج[1] بھر بھر دے

مآلِ زندگانی دے نشاطِ نوجوانی دے
مرادِ قلبِ محزوں دے دوائے جانِ مضطر دے

شرابِ ارغوانی ہو یہی جوشِ جوانی ہو
مزا ہے موسم گل کا جو رندوں کے خدا زر دے

سمائے ہیں دلوں میں بے طرح دھڑکے قیامت کے
پلاکر جام اے ساقی! نویدِ حوضِ کوثر دے

دکھا دے ہم کو مرزا[2] لیلٰی و مجنوں کی تصویریں
شرابِ شوق کے شیشے سے متوالا ہمیں کر دے

۱- تصحیح قیاسی-

۲- مرزا تخلص ہے مرزا محمد ہادی ابن مرزا محمد تقی ابن آغا ولی کا جو کہ اس مرقع کا مصنف ہے - اس شعر کو جس میں تخلص واقع ہوتا ہے، مقطع کہتے ہیں-

تصوّر[۱]

دن رات سیر کر کے سفید و سیاہ کی
تصویریں[۲] کھینچتے ہیں ترے جلوہ گاہ کی

کیا کیا کیا ہے نامۂ اعمال کو سیاہ
ہم شاعروں کو فکر رہی ہے گناہ کی

میری غزل دلوں پہ نہ کیوں کر اثر کرے
صورت ہے ہو بہو مرے حالِ تباہ کی

۱- صنف کلام : مطلع و دو شعر غزل ۔ بحر مضارع وافی اخرب مکفوف و محذوف ۔ وزن : مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن ، دو بار ۔ قصد شاعر : بیان اس امر کا کہ شروع تالیف کے وقت مصنف کا کیا خیال تھا ۔ اس کے نزدیک شاعری ایک قسم کی مصوری ہے ، اور اس امر کو اُس نے کتاب ''استشعار'' میں نہایت توضیح کے ساتھ بیان کر دیا ہے ۔

ایکٹ پہلا

پہلا سین ــــــ دیوان خانہ

عبداللہ

(دست بہ دعا)

الٰہی[1] قاضی الحاجات ہے تو بندہ پرور ہے
معینِ بےکساں ہے ، داد رس ہے ، فیض گستر ہے

ترے دربار سے شاہ و گدا در مان پاتے ہیں
تری سرکار سے ہر شخص کی روزی مقرر ہے

ہر اک رنج و تعب میں کون ہے تیرے سوا یا رب !
ہر اک درد و مصیبت میں خدایا تو ہی یاور ہے

کوئی اب غم ہے یا رب تو فقط اولاد کا غم ہے
کہ یوں تو فضل سے تیرے مجھے سب کچھ میسّر ہے

خدایا ! دے کوئی فرزند جس سے نام روشن ہو
کہ بے اولاد میرا گھر سیہ خانے سے بدتر ہے

بہ حق آل احمدؐ ہو دعا مقبول عاجز کی
یہ عبداللہ بھی یا رب ! ترا اک عبد احقر ہے

۱- صنف کلام : غزل مسلسل (خطابی) بحر ہزج سالم - وزن : مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ، دوبار - قصد شاعر : اظہار عظمت باری تعالیٰ و اخلاص عبد و معبود - شکر نعمت بہ اظہار امارت و مکنت جو کہ عبداللہ کو حاصل تھی از روئے پسر جہت بقائے نام و ریاست خاندانی - تمسک بہ اہل بیت رسالت علیہم السلام -

دوسرا سین ــــــ کنار چمن

عبداللہ (دل میں[1])

دنیا[2] امید پر ہے قائم
امید سے ہے حیات دائم

امید پہ ہے یہ سب زمانہ
امید سے ہے یہ کارخانہ

امید سے زیست کا مزا ہے
امید ہی اصل مدّعا ہے

امید خوشی کی سر بہ سر ہے
زوجہ میری بھی بار ور ہے

گزرے سب انتظار کے دن
نزدیک آئے بہار کے دن

پورے دن ہو گئے بہ آرام
اب دیر نہیں ہے صبح یا شام

ہوتا ہے خدا کا فضل مجھ پر
اب دیکھیے ہو پسر کہ دختر

کچھ اس کی نہیں مجھے شکایت
جو دے اللہ کی عنایت

۱- یعنی اپنے آپ سے -
۲- صنف کلام : مثنوی بحر ہزج مجز واخرب مقبوض محذوف یا اخرام اشترمحذوف ، وزن : (۱) مفعولن فاعلن فعولن- وزن : (۲) مفعول مفاعلن فعولن دوبار- قصد شاعر : اظہار مسرت بہ امید اولاد جس میں تھوڑی سی بیم بھی ملی ہوئی ہے -

خدمت گار (هاتھ اٹھا کر)

الٰہی[1] خداوند نعمت سلامت !
مبارک مبارک سلامت سلامت !

خدا نے کیا آپ پر فضل اپنا
مبارک ہو فرزند حضرت سلامت

پلے آپ کے دامنِ عافیت میں
رہے یہ پسر تا قیامت سلامت !

رہے باپ بیٹوں پہ مالک کا سایہ !
مع جاہ و اقبال و دولت سلامت !

ہوا آج سرکار پہ فضل خالق
یہ سرکار اور یہ ریاست سلامت !

عبداللہ

اے[2] تری شان کے صدقے مالک !
تیرے احسان کے صدقے مالک !

مجھ سے ناشاد کو کیا شاد کیا
کہ مجھے صاحبِ اولاد کیا

۱۔ عام صورت امرا اور روسا سے اس درجہ (خدمت گار) کے لوگوں کے خطاب کرنے کی ہے ۔ صنف کلام : غزل اور قطعہ بھی کہہ سکتے ہیں ۔ بحر متقارب سالم ۔ وزن : فعولن فعولن فعولن فعولن ، دوبار ۔ قصد شاعر : اظہار مسرت خدام بہ کامیابیٔ مخدوم ۔ اظہار بہجت کے ساتھ کسی قدر خوشامد بھی ملی ہوئی ہے ۔ انعام وغیرہ کا ذکر ترک کیا گیا تا کہ عبداللہ کی فیاضی اور نوکروں کی ذاتی خوشی ثابت ہو ۔

۲۔ صنف کلام : مثنوی بحر رمل مجز و مخبون مسکن محذوف ۔ وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلن ۔ قصد شاعر : اظہار شکر بہ ازائے کامیابی ، حالت مسرت تھوڑے الم کے ساتھ ملی ہوئی ہے ۔

کس زباں سے ہو ترا شکر ادا
تو نے بندے پہ کیا فضل اپنا

جو دیا ہے تو جِلا دے اس کو!
ہر اک آفت سے بچا دے اس کو!

با سعادت ہو یہ میرا فرزند!
ذی لیاقت ہو یہ میرا فرزند!

تیسرا سین ـــ محل سرا (زچہ خانہ)

(ڈومنیاں گاتی ہیں)

یہ کنبے[1] کا سردار پیدا ہوا ہے
ریاست کا مختار پیدا ہوا ہے

۱۔ صنف کلام : غزل بحر متقارب سالم ۔ وزن : فعولن فعولن فعولن فعولن ، دوبار۔ قصد شاعر : اظہار مسرت زبانی عورات درجۂ ادنیٰ ۔ ایسے موقع پر ڈومنیاں خود ہی کچھ اسی قسم کے شعر موزوں کر کے گاتی ہیں اور ان میں خاص خاندان کا حال بھی حتی الوسع بیان ہوتا ہے اور کلمات خوشامد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس قسم کی چیزیں جو گائی جاتی ہیں ، اُن کو زچہ خانے کا گیت کہتے ہیں - لڑکا ہونے کے بعد تقریب (سو - زاج) چھٹی تک برابر تمام شب اور دن کو بھی گانا رہتا ہے اور اس گانے سے یہ بھی نفع ہے کہ رات بھر جاگ رہے ، اس لیے کہ ان ایام میں جاگنا رات بھر کا بچے کی حفاظت کے لیے آسیب وغیرہ سے کہ اس موقع کے لیے مختص ہیں ، ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ غریب خاندانوں میں جن کو ہر روز ڈومنیوں کے رکھنے کا مقدور نہیں ہے ، بچے کی خالہ ، پھوپھیاں اور ایسی ہی متوسل عورتیں چھٹی جاگتی ہیں اور گاتی بجاتی رہتی ہیں ، اور امیروں میں بھی عورتیں گاتی ہیں لیکن ڈومنیوں کے ساتھ شریف عورتوں کا شریک ہو کر گانا معیوب سمجھا جاتا ہے ۔

یہ ہے اپنے بابا کی آنکھوں کی پتلی
یہ امّاں کا دل دار پیدا ہوا ہے

یہ لڑکا ہے سب قوم عام کو پیارا
یہ کنبے کا سالار پیدا ہوا ہے

حسینوں کا دل کیوں نہ ہو اس پہ صدقے
یہ بانکا طرح دار پیدا ہوا ہے

مثل ہے کہ ہوتے ہیں اچھوں کے اچھے
یہ بچہ خوش اطوار پیدا ہوا ہے

کھلی اس کے ہونے سے قسمت ہماری
غریبوں کا غم خوار پیدا ہوا ہے

چوتھا سین ـــــ دیوان خانہ

عبداللہ

ارے[1] کوئی حاضر ہے یاں؟ جلد جائے
ابھی اپنے ہمراہ کاہن کو لائے

خدمت گار

[2]بہت خوب ابھی جا کے لاتے ہیں ہم
جہاں وہ ملے گا بلاتے ہیں ہم

(خدمت گار جاتے ہیں ، کاہن کو لے کے آتے ہیں)

۱- صنف کلام : مثنوی بحر متقارب سالم و مزاحف - وزن : فعولن فعولن فعولن فعولن ، دوبار۔
۲- وزن : فعولن فعولن فعولن فعل - صرف یہ شعر اس وزن پر ہے ، باقی تمام اشعار کا وزن سالم ہے - اس نمایش میں کاہن کا بلانا ، اس کا آنا اور گفتگو وغیرہ بیان کی ہے - یہ رسم ہندوستان میں غیر شرع مسلمانوں میں جاری ہے - مولود کا زائچہ (جنم پترہ) کھینچوایا جاتا ہے ، امر شرع شریف کے بالکل خلاف ہے -

کاہن

کیا آج[1] کاہن کو کیوں سرفراز
خداوند کی عمر ہوئے دراز!

عبداللہ

پسر کا مرے کھینچ تو زائچا
ذرا حال قسمت کا اس کے بتا

کاہن

(زائچہ بنا کے اور انگلیوں پر شمار کرکے)

یہ لڑکا بڑا صاحب نام ہوگا
حسینوں سے اُس کو سدا کام ہوگا

کسی کی محبت کا یہ دم بھرے گا
نہ اُس بن جیے گا نہ اُس بن مرے گا

بہت اس کی طینت میں ہو پاک بازی
حقیقی بنے اس کا عشقِ مجازی

کہیں گے اسے لوگ وحشت کا پُتلا
پھرے گا بہت دن یہ صحرا بہ صحرا

۱- جو لوگ علم نجوم کو حق نہیں مانتے وہ اس کو اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ قصد شاعر اس نظم میں یہ ہے کہ کاہن کی زبانی مجنوں کی سوانح عمری کو جو اس کی ولادت کے وقت شروع ہوئی تا انجام حیات ایک ایسی تقریر میں بیان کی جائے کہ اگر وہ بالفرض عبداللہ کے سامنے بیان کی جاتی تو اس کو خلاف نہ گزرتی، اور وجہ خلاف نہ گزرنے کی یہ ہے کہ کاہن عشق مجازی سے ابتدا کر کے فوراً عشق حقیقی کو شروع کر دیتا ہے اور عشق حقیقی کے بیان کے بعد مجنوں کے مصائب کو جو ذکر کرتا ہے، وہ کسی باپ کو جو مسلمان ہے، برے نہیں معلوم ہو سکتے، اس لیے کہ اللہ کی راہ میں مر جانا ہمارا عین ایمان اور مقصود اعلیٰ ہے۔

محبت کا آزار گھڑیوں بڑھے گا
جنوں بن کے جِنّ اس کے سر پر چڑھے گا

محبت اسے پھر ٹھکانے لگا دے
خودی سے چھڑا کر خدا سے ملا دے

اگر نام پوچھو تو ہے قیس بہتر
مگر لوگ مجنوں کہیں اس کو اکثر

مبارک ہے یہ نام اور وہ لقب بھی
سعادت ہے یہ عشق اور وہ طلب بھی

جنوں اور وحشت میں یہ بے بدل ہو
یہ لڑکا محبت میں ضرب المثل ہو

عجب گُن ہیں اس کے عجب کام اس کے
ہزاروں ہی دنیا میں ہوں نام اس کے

سنو نام کا اس کے اسرار تم اب
کہ ہر حرف میں ہے نہاں ایک مطلب

کہ ہے 'قاف' سے یہ قتیلِ محبت
ہوئی 'یا' سے کچھ یادِ جاناں کی صورت

کھلا 'سین' سے یہ سراپا الم ہے
سیہ بخت ہے سینہ چاکِ ستم ہے

ملے ہیں جو سب حرف، اس میں ہے یہ سِر
کہ ہو وصل کا اس کے انجام آخر

نہ پوچھو کہ کیوں قاف سے ابتدا ہے
کہ یہ عشق میں حرفِ آخر پڑا ہے

زمانے میں جو عشق کی انتہا ہو
وہ اس طفل کے عشق کی ابتدا ہو

نہ پوچھو کہ کیوں درمیاں حرف 'یا' ہے
کہ بس یار ھی یار دل میں بسا ہے

پڑا 'سین' آخر میں اس کا سبب کیا
کہ آخر سعادت ہے انجام اس کا

یہ بدنام ھو کر نکو نام ھوگا
وہ آغاز ھوگا یہ انجام ھوگا

عبداللہ (خدمت گاروں سے)

کاھن کو یہاں سے لے کے جاؤ
انعام خزانے سے دلاؤ

(دل میں)

قسمت[1] کی کسی کو کیا خبر ہے
اللہ کے ھاتھ سر بہ سر ہے

انجام میں ھو اگر بھلائی
ھو پہلے بدی تو کیا برائی

۱- صنف کلام : مثنوی بحر هزج مجز و اخرب مقبوض محذوف ۔ وزن : مفعول مفاعلن فعولن - قصد شاعر : اس کا بیان کہ عبداللہ کاھن کے اس کلام سے کیا نتیجہ نکالتا ہے ۔ عبداللہ پر حالت مسرت شدید کی طاری ہے - کاھن کی وھمی گفتگو سے اس کی وہ مسرت زائل نہیں ھوسکتی - جو کچھ الم اس کو ھوا ، اس کو مذھبی خیالات سے ٹال رھا ہے اور اس ذھنی مجادلۂ لذت و الم میں لذت کو کامیابی ھوتی ہے - اس تمائش کو کسی قدر تاریخ سے مناسبت ہے اس لیے کہ وہ زمانہ شروع اسلام کا تھا ، ھر ایک با ایمان مسلمان کے دل میں جوش مذھبی بھرا ھوا تھا ، ھر ایک سچے مسلمان کا یہ مقصد اعلیٰ تھا کہ میں اور میری اولاد جہاد میں نام آوری پیدا کرے ۔

بے شک یہ پسر ہے صاف باطن
کہتا نہیں ہے صاف کاہن

بے شک یہ پسر ہے با سعادت
ہے اس کے نصیب میں شہادت

عشقِ مولا کا دم بھرے گا
اللہ کی راہ میں مرے گا

یہ طفل مرا سعید ہوگا
یہ طفل مرا شہید ہوگا

پانچواں سین محل سرا (عبداللہ کی ڈیوڑھی)

محل دار (چِلّا کے)

ڈیوڑھی[1] پہ ارے یہاں کوئی ہے
کب تک چِلّاؤں کوئی بھی ہے

۱۔ صنف کلام : مثنوی بحر ہزج و اخرب مجز و اخرب مقبوض محذوف۔ وزن : مفعول مفاعلن فعولن۔ اخرام اشتر محذوف۔ وزن : مفعولن فاعلن فعولن۔ قصد شاعر اس نمایش میں :

محل سرا (یعنی مکان زنانہ ، جائے سکونت محلات و صاحبات امرا) کے دروازے پر جو امور واقع ہوتے ہیں ، ان میں سے بعض امور کا ذکر منظور ہے ۔ محل دار اس عورت ملازمہ کو کہتے ہیں جو بیگم صاحبہ کے حکم احکام باھر نوکروں تک پہنچاتی ہے اور باھر کی اطلاع یابی اور عرض و معروض اندر محل میں لے جاتی ہے ۔ یہ عہدہ اکثر مسّن اور فہمیدہ عورت کو دیا جاتا ہے ۔ باھر کے نوکر چاکر اس سے ڈرتے رہتے ہیں کیوں کہ اس کی رسائی بیگم صاحبہ تک ہے ، موقوفی بحالی تک میں اس کو دخل ہے ۔ جو نوکر چاکر اس سے ملتے رہتے ہیں ، وہ اکثر بیگم صاحبہ کی خفگی اور سخت کاموں سے بچتے ہیں ۔ دایہ (جس کو لکھنؤ میں عموماً ''اناجی'' کہتے ہیں) ، وہ عورت

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

(جھنجلا کے اور خوب چیخ کے)

دیکھو کب سے پکارتی ہوں
مردہ بول اٹھے کوئی ''ہاں ، ہوں''

خدمت گار

(محل دار سے مخاطب ہوکر)

کہیے کیا حکم ہے محل دار
آواز تو دے رہا ہوں ـــــ

(چپکے سے) مُردار[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
ہے جو طفل کو دودھ پلاتی ہے - امیر عورتیں اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی ہیں - اناجی اکثر شریف مگر نہایت غریب گھرانے کی ہوتی ہے - جو عورتیں اس نوکری کو قبول کرتی ہیں وہ اپنے کنبے میں نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں - کوئی شریف خاوند اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی عورت کسی بچے کو کچھ ماہ واری لے کر دودھ پلائے - عزیزوں کے لڑکے کو مفت دودھ پلانا بہ رضائے خاوند کچھ ایسا عیب نہیں ہے - اناجی کے حقوق بہت کچھ ہوتے ہیں ، وہ عورت جو اجورہ لے کے دودھ پلائے اس کو انا کہہ سکتے ہیں -

۱- محل دار اور اس کے ماتحت ملازموں میں جو نا اتفاقی ہو جاتی ہے ، تو ایسے ہی کچھ نتیجے پیدا ہوتے ہیں - اناجی کی عزت محل میں بہت ہوتی ہے - خود نواب صاحب اور بیگم صاحبہ اس کی عزت کرتی ہیں ، اور اس کے حقوق بھی بہت ہوتے ہیں - جس لڑکے کو وہ دودھ پلاتی ہے ، وہ اس کا 'پلایا' کہلاتا ہے - ہر ایک پلائے کی شادی میں امرا کی سرکار سے ایسا کچھ ملتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لیے مالا مال ہو جاتی ہے - انا کو بھی اپنے پلائے سے بہت محبت ہوتی ہے - انا اور کاھن کی گفتگو میں نجومیوں کی فال کھولنے اور جاھل عورتوں کی سریع الاعتقادی کی صورت ایکد شاعرانہ طریقے سے دکھائی گئی ہے -

محل دار

ہے قیس کا آج حال ابتر
لے آ کاھن کو جلد جا کر

نوکر

(محل دار سے مخاطب ھوکر)

لو اس کو ابھی میں جا کے لایا

(کاھن کو لا کے ، ڈیوڑھی پر پکار کے)

کہ دو اَنّا سے کاھن آیا

(دایه طفل کو پردے کے باھر لے کے آتی ھے)

کاھن

اَنّا جی سلام ، کہیے کیا حکم
لاؤں میں آپ کا بجا حکم

دایه

(کاھن سے مخاطب ھوکر ، طفل کو دکھا کے)

کاھن تو جلد فال تو کھول
بچے کا مرے حال تو کھول

اس بچے پہ یہ بجوگ کیا ھے
کاھن ! آخر یہ روگ کیا ھے

بھولے سے نہیں کبھی یہ سوتا
سوتا ھے ، خواب میں ھے روتا

کیا بات کسی نے تھی کہی یہ
سوتا نہیں خواب میں کبھی یہ

پہروں نہیں ھائے دودھ پیتا
کیا جا' یہ کس طرح ھے جیتا

(گویا اُس کی گود میں دے دیتی ھے)

تو دیکھ تو کیا بساط اس کی
مر جائے کہیں نہ دائی بندی

(آسمان کی طرف دیکھ کر)

آئی ہو جو اس کی مجھ پہ آ جائے
سر سے اس کے الا بلا جائے

کاہن (فال کھول کے)

دایہ تجھے اس کی کیا خبر ہے
یہ عشق کا بھید سر بہ سر ہے
تو باغ[1] گئی تھی جھٹپٹے وقت
اس بچے کو لے گئی تھی بے وقت
وہ ہو نہ ہو پنج شنبے کا دن

دایہ

سچ ہے تیری یہ بات کاہن

کاہن

تھا گود میں تیرے یہ گل تر
تھی سرخ کلاہ اس کے سر پر

۱- باغ کا سماں جو یہاں بیان کیا گیا ہے، اس میں وحشت اور بھیانک پن کا رنگ ملایا ہے۔ شاعر کا قصد ہے کہ لذت و الم خوف و رحم کے آثار ایک ہی ساتھ پیدا کرے۔ باغ کے بیان میں لذت کی تخییل زیادہ ہوگی اور الم کی کم اور شمع و پروانے کی اس کے بر عکس ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آسیب کا تصور ایک تربیت یافتہ ذہن پر کم اثر پیدا کر سکتا ہے، گو کہ عورتوں کی تخییل پر اس سے بہت کچھ اثر ہوتا ہے مگر مردوں کی تخییل پر بہت کم لیکن جلنے کا تصور ہر شخص پر بہت اثر رکھتا ہے، عام اس سے کہ تعلیم یافتہ ہو یا نہیں، مرد ہو یا عورت۔

کُرتے کا تھا رنگ زعفرانی
اور گوٹ لگی تھی اس میں دھانی
اس وقت نہا کے تو اٹھی تھی ؟

دایہ

کاہن ! ہاں یہ خطا تھی میری

کاہن

چوٹی تیری کھلی ہوئی تھی
پوشاک بتاؤں اب میں تیری
تھا اودے رنگ کا دوپٹا
پہنے تھی سرخ پائجامہ

دایہ

کاہن کچھ اور حال بتلا
سب سچ کہتا ہے تو کہے جا
اتنا تو بتا دے پہلے للہ
ہے جان کی خیر یا نہیں آہ ؟
ہونا تھا جو اس کے واسطے یوں
ہے ہے! اسے لے کے میں گئی کیوں
کاہن یہ سب مری خطا ہے
بچے کا قصور اس میں کیا ہے

کاہن

سن دایہ کچھ اور حال اس کا
تا تجھ کو رہے خیال اس کا
تیرا بھی نہیں قصور اس میں
کچھ اور ہی ہے فتور اس میں

جب تو نے چمن کی سیر کی تھی
اک آگ سی واں لگی ہوئی تھی

پھولی ہوئی تھی شفق فلک پر
چلتی تھی ہوائے تند صر صر

سوسن بہ زبان بے زبانی
کہتی تھی عشق کی کہانی

پھولوں کی ہنسی تھی کچھ بھیانک
اک شور مچا تھا واں اچانک

وہ سرو ، وہ سایہ ، وہ لبِ جُو
اور واں پہ وہ قمریوں کی کُو کُو

واں تھا وحشت پری کا پھیرا
سیمرغ جنوں کا تھا بسیرا

اک چڑیا پُھر سے اُڑ گئی تھی
تو دیکھنے جس کو مُڑ گئی تھی

تھا حضرتِ عشق کا تو سایہ
ناگہ دیوِ الم بھی آیا

(حضرت عشق کے نام پر دایہ کا بلائیں لینا)

ہنسنے پہ گلوں کے کھلکھلا کر
اک بار ہنسا تھا یہ گلِ تر

نرگس کے پاس رو دیا تھا
کچھ ہو کے اداس رو دیا تھا

سنبل سے یہ پیچ و تاب میں تھا
سبزے کے قریب خواب میں تھا

ناگہ بلبل کی آئی آواز
آواز میں کچھ تھا سوز کچھ ساز

سوتے میں سے چونک اٹھا یہ بےتاب
اس وقت یہ ہو گیا تھا بد خواب

کیا خواب میں دیکھتا ہے یہ گل
ہے یاس امید عشق بالکل

شبنم کو اس نے روتے دیکھا
بلبل کو جان کھوتے دیکھا

پامال خزاں یہ باغ دیکھا
لالہ کے جگر کا داغ دیکھا

سمجھا کہ یہ عشق کی سزا ہے
اس باغ کی بس یہی ہوا ہے

یہ حضرت عشق کا عمل ہے
آسیب جنوں کا کچھ خلل ہے

وحشت کا ہے اس کے سر پہ سایا
سودا کچھ دل میں ہے سمایا

دایہ

کاہن بتلا کوئی آتارا
جینے کا تو اس کے ہو سہارا

اس بچے کے حال پر ترس کھا
اس حسن و جمال پر ترس کھا

کاہن

کچھ خوف تو جان کا نہیں ہے
اس دکھ کی مگر دوا نہیں ہے

کیا اس کا بتاؤں میں آتارا

دایہ (ہاتھ جوڑ کے)

کاہن ! بتلا تو کچھ خدا را

کاہن

دایہ ! ہے عشق کی دوا حُسن
ہے عشق تو آگ اور ہوا حُسن

یہ آگ جو اس ہوا سے بھڑکے
جلنے والا کبھی نہ پھڑکے

جلنے کا مآل دیکھ لے تو
پروانے کا حال دیکھ لے تو

فانوس میں ہو جو شمع روشن
پروانے کی دیکھے کوئی الجھن

بے تابیٔ شوق کوئی دیکھے
جل جانے کا ذوق کوئی دیکھے

اندر شعلہ لپک رہا ہے
باہر یہ سر پٹک رہا ہے

فانوس کا پردہ ہے جو حائل
مضطر ہے یہ مثلِ نیم بسمل

پردہ جو درمیاں نہ ہوتا
اک بار جل کے جان کھوتا

دایہ

کاہن کچھ صاف صاف بتلا
میں تو سمجھی نہ یہ معمّا

کاہن

جینا اس کا اگر ہے مطلوب
دکھلاؤ اس کو جمالِ محبوب

یعنی کچھ لوگ خوب صورت
کرتے رہیں جان و دل سے خدمت

پریوں میں یہ طفل پرورش پائے
دُکھ دور ہو دل کی سب خلش جائے

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ دوسرا

پہلا سین ــــــ محل سرا

(مجنوں کھیلتا اور خوش ہوتا نظر آتا ہے)

مجنوں (دل میں)

واہ[1] کیا نام ہے میرا مجنوں
واہ کیا نام ہے میرا مفتوں

دل سے بھایا مجھے مجنوں کہنا
کیا خوش آیا مجھے مجنوں کہنا

شوق[2] ہے شعر و سخن سے مجھ کو
ذوق ہے سیرِ چمن سے مجھ کو

۱- صنف کلام :- مثنوی بحر رمل مخبون مسکن محذوف - وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلن - قصد شاعر : مجنوں کے لڑکپن کی وضع اخلاق، طرز معاشرت کا بیان - بہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ لڑکپن سے عاشق مزاج حسن پرست ہے اور اس کو شعر سے بھی ذوق ہے - اس مزاج کا لڑکا جوان ہو کر یا شاعر ہوگا یا حکیم یا دیوانہ -

۲- مجنوں کو شعر گوئی میں بہت اچھی دست گہ حاصل تھی چنانچہ اس کا دیوان جو والبی نے جمع کیا ہے، قابل ملاحظہ ہے -

ف : اگر مجنوں کے والدین اُس کی تربیت میں بچپن سے توجہ کرکے اس کو حسین خواصوں کی صحبت سے بچاتے اور فطرت کی ظاہری خوب صورتی کی طرف متوجہ کرتے تو وہ شاعر ہوتا - اگر اس کو ظاہری خوب صورتی کی طرف کچھ دنوں متوجہ کر کے اخلاقی اور ذہنی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲ پر)

(خواصیں آتی ہیں)

(ان کی طرف دلی اشارہ کر کے خواصوں سے مخاطب ہو کر)

ہیں یہ خدمت میں گل اندام خواص
خاص ہیں میری یہ گلفام خواص
ہے شفا بادۂ عشرت میری
ہے دوا جام محبت میری

(خواصوں سے مخاطب ہو کر)

آؤ اے میری خواصو آؤ
گاؤ اے میری خواصو گاؤ

خواصیں (سب کی سب مل کے)

خدا[1] جانے کس کا یہ دل مبتلا ہے
کہ پہلو میں اکثر اُسے ڈھونڈتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
حقیقی جمال کی طرف متوجہ کرتے تو وہ عاشق علم یعنی فلسفہ ہوتا ۔ ان دونوں قسموں کی تعلیم کی طرف سے اس کے والدین نے غفلت کی اور بچپن سے حسن ظاہری انسانی کی طرف متوجہ کیا گیا ، لہذا وہ دیوانہ ہوا ۔

۱۔ صنف کلام : غزل مسلسل بحر متقاربہ سالم - وزن : فعولن فعولن چار بار۔ قصد شاعر : خواصیں ایک امیر زادے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور عشق مجازی کی لذتوں سے اس کو بے خبر پا کر اپنے فریب میں لایا چاہتی ہیں - ہمارے ملک کے اکثر لڑکوں کا لڑکپن میں یہی حال ہوتا ہے اور سن بلوغ کے قبل ہی گناہ گار ہو جاتے ہیں ، اور طرح طرح کے امراض مہلکۂ جسمانی و روحانی میں مبتلا ہو کر دنیا و عقبیٰ کہیں کے نہیں رہتے - ماں باپ پر فرض ہے کہ اپنے بچوں کو ان بلاؤں سے بچائیں مگر افسوس ہے کہ ہمارے اہل ملک خصوصاً رؤسا کو اس کا کچھ خیال نہیں -

(گویا مجنوں سے مخاطب ہو کر)

مزا دردِ اُلفت کا کچھ ہم سے پوچھو
تمھیں کیا خبر عشق میں کیا مزا ہے

ابھی کھیل سمجھے ہو تم عاشقی کو
کہے رکھتے ہیں ، دل لگانا برا ہے

سمجھ بوجھ کے دل لگانا کسی سے
برا ہے وہ معشوق جو بے وفا ہے

تمھیں کیا خبر شوق کہتے ہیں کس کو
تمھاری بلا جانے کیا مدّعا ہے

بتاؤ تو کیا شے ہے آزارِ فرقت
یہ وصلت بھلا کس مرض کی دوا ہے

شراب محبت کے نشے ہیں کیسے
خمار اُس کا کیا ہے آثار اُس کا کیا ہے

دوسرا سین——دیوان خانہ

(تقریب بسم اللہ[1] مجنوں)

۱- تقریب بسم اللہ مسلمانوں میں خاص ہے ، وہ دن جب لڑکا پہلے پہل پڑھنے کو بٹھایا جاتا ہے - اکثر پانچ برس کے سن میں یہ تقریب ہوتی ہے - اس میں ماں باپ موافق اپنے اپنے حوصلے کے بہت کچھ دھوم دھام کرتے ہیں - مردانے اور زنانے میں دونوں جگہ مہمان جمع ہوتے ہیں - مولوی صاحب جو "بسم اللہ" پڑھاتے ہیں ، اُن کو حسب مقدور کچھ نہ کچھ نذر دی جاتی ہے - امیروں میں خلعت ، سونے چاندی کے قلم دوات ، تختی وغیرہ ، غریبوں میں کچھ زر نقد قدر قلیل ، کوئی کپڑا ، شیرینی وغیرہ -

اس دھوم دھام کی فکر اس طرح کی جاتی ہے کہ اکثر لڑکے کا سن زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ اچھی طرح آوارگی کا سبق خراب لڑکوں لڑکیوں میں کھیل کھیل کر حاصل کر لیتا ہے اور اُس کی قابلیت تربیت پذیری بالکل زائل ہو جاتی ہے -

مصاحب

طفلِ[1] غنچه کی چمن میں آج بسم اللہ ہے
جس طرف دیکھو اُدھر اللہ ہی اللہ ہے

(عبداللہ اور مجنوں آتے ہیں)

عبداللہ

(قیس سے مخاطب ہوکر)

سنو[2] اے قیس که هوتا ہے تمهارا مکتب
تم کو لازم ہے دل و جان سے پڑھو علم و ادب
یه ادب کیا ہے شرافت کی علامت اے قیس !
که ادب هی سے تو ممتاز ہوئ قوم عرب

قیس

مجھ کو[3] کیا عذر ہے اے قبله و کعبه ! اس میں
یه تو ہے عینِ مراد اور یه عینِ مطلب

۱- صنف کلام : مطلع بحر رمل وافی محذوف ۔ وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ، دو بار ۔ قصد شاعر: عبداللہ کے مصاحب اس بات کو ظاهر کر دیں که آج قیس کا مکتب دھوم دھام سے ہونے والا ہے ۔

۲- صنف کلام : قطعه جزو قصیده بحر رمل واقی مخبون مسکن محذوف ۔ وزن :— فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ، رکن اول بعض مصرعوں میں سالم ، یعنی : فاعلاتن اور بعض میں مخبون یعنی فعلاتن لے لیا ہے ۔

۳- قیس کے طرز کلام سے ظاهر ہے که اس کا سن پانچ برس کا نہیں ہے بلکه کم از کم دس گیارہ برس کا ہے ، اور ایسا امرا میں اکثر هوتا ہے که لڑکا اس سن تک محل سے باهر نہیں نکلتا ، جیسا که قبل اس کے بیان کیا گیا ۔

عبداللہ

دیکھو آخوند بھی آ پہنچے کرو جھک کے سلام
یہ وہ ملا ہیں محلّے میں ہے جن کا مکتب

(مولوی عشق الدین آتے ہیں ، قیس کا ادب سے سلام کرنا)

عبداللہ

میری تسلیم ادھر آئیے مولانا عشق
میرا بیٹا ہے یہ قیس آج ہے اس کا مکتب

مولوی

ما شاء اللہ[1] بہت نیک ہیں صاحب زادے
میں پڑھاؤں گا دل و جاں سے انہیں علم و ادب

عبداللہ

میں کبھی آپ کی خدمت سے نہ منہ موڑوں گا
واجباً عرض کیا ، گو کہ یہ ہے ترکِ ادب

۱۔ مولوی کے بیان سے خوشامد کی بو آتی ہے ۔

ف ۔ تعلیم دینے کا اجورہ لینا بالکل ناجائز ہے ۔ ایک ادنیٰ درجے کے معلم سے جیسا کہ عشق الدین ظاهر کیا گیا ہے ، اجورہ تعلیم کا فیصلہ کرنا یا چکانا معیوب نہیں ہے مگر عبداللہ اس مقام پر نہایت متانت اور ریاست کو کام فرماتا ہے ۔ عبداللہ اپنے بیٹے کی تعلیم میں نہایت سرگرم اور مستعد معلوم ہوتا ہے ، اور خود بھی آس کو علم سے بہرہ ہے جیسا کہ اس کی گفتگو سے ظاهر ہے ، مگر واقع میں وہ بڑی غلطی کر رہا ہے کہ وہ اپنے پیارے لڑکے کو ایک کم حقیقت ملا کے سپرد کرتا ہے ، مگر اس نے اس بات میں دھوکا کھایا ہو تو عجب نہیں ، اس لیے کہ ملا کی ظاھری وضع نے اس کو فریب دیا کہ غلطی اس کی بے شک ہے کہ اس نے اس مولوی کے چال چلن کو کیوں نہ دریافت کر لیا ۔ اس غلطی میں اکثر والدین بجائے نفع پہنچانے کے اپنے بچوں کو ضرر پہنچاتے ہیں ۔ ایک کم استعداد اور بد وضع مولوی سے پڑھوانا اس سے بد تر ہے کہ لڑکا جاہل رہے ۔

علم ادیان سے پہلے اسے کیجے آگاہ
کہ مسلمانوں پہ واجب ہے یہ بلکہ اوجب
علم وجدان کی پھر دیجیے تعلیم اسے
تاکہ ماہیت ہر شے کا کھلے اس پہ سبب
میرے الطاف سے بہتر جو کریں آپ عتاب
گھر کے آرام سے خوش تر جو ہو مکتب میں تعب
دیجے تعزیر مناسب جو نہ ہو یاد سبق
دیجے تادیب ضروری جو کرے ترک ادب

مولوی

میں[1] تو ہوں خدمت طُلاّب کو حاضر ہر وقت
کچھ نہ تنخواہ کی حاجت نہ وظیفے کی طلب
علما پر ہے بہت آپ کا الطاف امیر
جو مناسب ہو مرے حق میں وہی ہے انسب

۱۔ مولوی عشق الدین بہ ظاہر نہایت مقطع اور متین بنتا ہے مگر اس کی اصلی حالت کسی نہ کسی پیرائے میں ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ اولاً تو وہ اپنے تئیں علما میں شامل کرتا ہے اور ایک بے طمع معلم بنتا ہے، پھر یہ بھی کہے بغیر نہیں رہتا کہ آپ تو خود ہی کچھ دیجیے گا، پھر مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ حقیقت میں وہ طامع ہے جیسا کہ اس کی طرز گفتگو سے ثابت کیا گیا ہے۔ عبداللہ کا علم دوست ہونا اس مصرع سے ظاہر ہے ''تا کہ ماہیت ہر شے کا کھلے اس پہ سبب'' اس لیے کہ یہ بہترین تعریف فلسفے کی ہے جو ایک امیر کی زبان سے ہم سن سکتے ہیں مگر ایسے امیر اگلے زمانے میں ہوں تو ہوں اب تو ایسے نہیں پائے جاتے، خصوصاً ہم اہل اسلام میں۔ عبداللہ کی دین‌داری بھی ظاہر ہے۔ ہم کو تعجب ہے کہ کسی زمانے میں امرا علم دین کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ قیس کی تادیب کے باب میں بھی عبداللہ کی رائے نہایت صحیح ہے؛ عجب نہیں ہے کہ عبداللہ ان لوگوں میں ہو جن کی عقل نظری تو درست ہوتی ہے مگر عقل عملی درست نہیں ہوتی، اس لیے کہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے اکلوتے فرزند کی تربیت کے باب میں غفلت نہ کرتا جیسا کہ اس نے کیا۔

عبداللہ

فائدہ کچھ نہیں تاخیر سے اب بسم اللہ
یہ کتاب اس کی ہے ----------

کتاب اخوند کو دے کے اور خوان اور کشتی کی طرف اشارہ کرکے) ------- ''وہ نذر کا سامان ہے سب'' ۔

ہے وہ کشتی میں تو عمامہ و رومال و عبا
اور اس خوان میں شیرینی و حلوا و رطب

مولوی (عبداللہ سے مخاطب ہو کر)

اس تکلف کی بہ ظاہر تو نہ تھی کچھ حاجت
(دل میں خوان و کشتی کی طرف اشارہ کرکے)
ہو زر نقد بھی کچھ اس میں وگرنہ ہے غضب

(مولوی قیس کو بسم اللہ پڑھاتا ہے)

عبداللہ

(رو بہ قبلہ دستِ دعا اٹھا کے)

بہ طفیلِ[1] علما و فضلائے اسلام
میرے فرزند کو تو علم عطا کر یارب!

۱- سب سے زیادہ عبداللہ کی دعا اس موقع پر نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے ہمارے رسول صلعم نے علما کی فضیلت میں ایسا کچھ فرمایا ہے کہ ان کے مرتبے کو شہدا سے بھی بڑھایا ہے، اور کیوں نہ ہو، اس لیے کہ یہی لوگ تو سچے حامی دین اور اسلام کے شیدا ہیں اور انہیں کے مساعی جمیلہ کی برکت سے دین اسلام ابھی تک دنیا میں باقی ہے - دھریوں کے حملے انہوں نے روکے، فلسفہ کے مقابلے سے انہوں نے بچایا، بادشاہوں کے ظلم سے انہوں نے نجات دلوائی، مگر افسوس آج کل کے علما ایسے دائرۂ تنگ و تاریک میں مرکز نشین اور زاویہ گزین ہیں کہ وہ کسی طرح دین اسلام کی حالت پر رحم نہیں کرتے - دنیا میں بے شمار اور مسلمانوں میں کروروں اور خاص ہندوستان میں لاکھوں اہل اسلام بد اعتقاد، فاسق، دھریہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸ پر)

تیسرا سین ــــ مکتب خانہ

(مولوی صاحب کا لڑکوں کو پڑھاتے نظر آنا
ایک ملازم کتاب لیے ہوئے ہمراہ)

مجنوں

(ایک خوب صورت لڑکی لیلیٰ کی طرف دلی اشارہ کرکے)

ہر جا[1] ہمیں اللہ کی قدرت نظر آئی
مکتب میں جو آئے تو یہ صورت نظر آئی

لیلیٰ

(دل میں قیس کو دیکھ کر)

مدت[2] میں یہ ہم چشم ہمارا نظر آیا
دل ڈھونڈتا تھا جس کو وہ پیارا نظر آیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
زندیق مسلک لا مذہب پائے جاتے ہیں - دہریت اور لا مذہبی کی بلا میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان زیادہ تر مبتلا ہیں، مگر ان کے نزدیک ابھی تک انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی والوں سے مناظرہ اور مباحثہ کرنا شرک ہے - بڑے افسوس کی بات ہے کہ علم کلام جس کو کسی زمانے میں ہمارے دین کے قابل فخر اور محقق علماء نے ایجاد کیا رونق دی، وہ بھی زنگ آلود تلوار کی طرح میان میں پڑا ہوا ہے - اب کون ایسا سپاہی ہے جو اس تلوار کو صیقل کرے اور میدان میں آکر توحید اور رسالت کے منکروں سے جہاد کرے -

۱- صنف کلام : مطلع غزل - ایک حسن پسند طبیعت پر کسی خوب صورت شے کو دیکھ کر پہلے پہل ایسا ہی کچھ اثر ہو سکتا ہے -

۲- صنفِ کلام : مطلع غزل اور وزن دونوں مطلعوں کا ایک ہے - بحر ہزج وافی اخرب مکفوف محذوف - وزن : مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن - لیلیٰ کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس مکتب میں وہ بٹھائی گئی تھی وہ اس کے رتبے اور شان کے موافق نہ تھا ؛ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے چچا کے بیٹے قیس کے مکتب میں داخل ہونے سے بہت خوش ہوئی -

(خون‌خوار خاں ایک سپاہی وضع اپنے بیٹے طرّار خاں
کو لے کے آتے ہیں)

خون خوار خاں

(لڑکے کان پکڑے ہوئے ہیں)

یہ[۱] لڑکا ہے میرا بڑا بے شعور

(مولوی صاحب سے)

پڑھا دیجیے علم اس کو ضرور

اسے گھول کر سب پلا دیجیے
گدھا ہے یہ انسان بنا دیجیے

مولوی

(نگاہ حیرت سے اس وضع اور اس انداز کو دیکھ کے)

ذرا نام نامی تو بتلائیے
صفت ان کی کچھ مجھ سے فرمائیے

۱۔ صنف کلام : مثنوی ، سوال و جواب ۔ اس مثنوی اور دیگر مثنویوں میں یہ فرق ہے کہ ان میں متکلم (راوی) شاعر خود ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص کا واقعہ بیان کرے اور اس میں متکلم خود وہی شخص ہوتا ہے جس پر واقعہ ہوا ، لہذا اس کو مثنوی مرقع (ڈرامیٹک) کہہ سکتے ہیں ۔

بحر متقارب وافی مقصور یا محذوف ۔ وزن : فعولن فعولن فعولن فعول یا فعل ۔ قصد شاعر یہ ہے کہ اس مکتب کی حیثیت کو مفصلاً بیان کرے ۔ اس میں کیسے لڑکے پڑھتے ہیں ، کس قسم کے لوگ آتے ہیں ۔ جاہلوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنا نام یا اپنے لڑکے کا بتاتے ہیں تو اس کا عرف اور پیار کا نام اور باپ دادا سکردادا سب کا ذکر اور نام اور خطاب بتاتے چلے جاتے ہیں ، یہاں تک کہ دوسرا آدمی ان کو چپ کرے ۔ خون خوار خاں نے تو بہت کمی کی کہ صرف اپنا ہی نام بتانے پر اکتفا کی مگر پھر بھی اپنی پیاری بی.بی کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰ پر)

خوں خوار خاں

میاں نام ہے ان کا جرّار خاں
ہیں جرّار خاں ابن خوں خوار خاں

بہت اپنی امّاں کے ہیں لاڈلے
وہ کہتی ہیں طرّار انہیں پیار سے

طرّار

الٰہی ! سلامت رہے میری ماں
اسی کا تو بیٹا ہوں میں بے گماں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

خوں خوار خاں کا خیال ہے کہ اس کا لڑکا بے شعور ہے - اگر وہ تحصیل علم کرے گا (جس کو وہ علم پڑھنا کہتا ہے) تو ضرور عقل مند ہو جائے گا - یہ خیال لغو ہے ؛ طینت اور فطرت تحصیل علم سے نہیں بدلتی ؛ خصوصاً وہ عادتیں جو اس کی خراب تربیت نے اس کے لڑکے کے اخلاق میں پیدا کر دی ہیں، کیوں کر بدل جائیں گی؟ اگر بہ قول اس کے مولوی صاحب اس کے لڑکے کو علم گھول کر پلا دیں (جس کی امید اس کو مولوی صاحب سے نہ ہونا چاہیے) پھر بھی وہ گدھا انسان نہیں بن سکتا ہے - اگر وہ واقعی گدھا ہے تو بے شک انسان نہیں بن سکتا - نہایت شریر لڑکوں کو ماں باپ اس لیے بھی اکثر مکتب میں بٹھاتے ہیں کہ ان کے سر سے بلا ٹلے ، کچھ دیر تو گھر میں امن و امان رہے - عجب نہیں کہ طرار خاں بھی انھی لڑکوں میں سے ہو - غریب ماں بہنوں کو بے شک کسی قدر راحت ہوگی مگر نا کردہ گناہ ہم مکتب لڑکے اس آفت میں مبتلا ہوں گے جس آفت سے بچنے کے لیے ماں باپ نے اس کو گھر سے فاضل ہونے کو نکالا ہے - مولویوں کو مناسب ہے کہ ہر ایک لڑکے کا چال چلن قبل اس کے کہ وہ مکتب میں داخل کیا جائے ، اچھی طرح تحقیق کر لیں اور اگر اس کو داخل کریں تو ضرور اور لڑکوں کو اس کے شر سے بچانے کے لیے ذمہ دار ہوں ، اور اگر اس ذمہ داری کو پسند نہیں کرتے تو کبھی ایسے لڑکوں کو مکتب میں نہ لیں - مولوی عشق الدین نے بھی غلطی کی جیسا کہ ظاہر ہوگا ، اور طرہ یہ ہے کہ مولوی صاحب اس لڑکے کا قیافہ سمجھ گئے تھے مگر مکتب کے معمول کی طمع سے بٹھا ہی لیا -

مولوی (لڑکوں سے مخاطب ہو کر)

قیافے سے ہے اس کے ثابت یہ بات
یہ لڑکا حقیقت میں ہے بد صفات

(خوں خوار خاں سے مخاطب ہو کر)

حقیقت میں عیّار مکّار ہے
حقیقت میں طرّار فرّار ہے

خوں خوار خاں

ذرا آپ ٹھیک اس کو کر لیجیے
شرارت کرے تو سزا دیجیے

مولوی

اگر یہ شرارت کرے گا یہاں
میں توڑوں گا خوب اس کی سب پسلیاں

طرّار (دل میں)

ہے[1] قصّاب یہ مولوی نابکار
چھڑا اس کے پنجے سے پروردگار!

مولوی

(خوں خوار سے مخاطب ہو کر)

پڑھاؤں گا معقول و منقول سب
مگر لوں گا مکتب کا معمول سب

۱- اس قول سے ظاہر ہے کہ طرار کے دل میں مولوی کی وقعت بالکل نہیں ہے ؛ اس کو استادوں سے ڈرنا تو آ گیا ہے مگر محبت کرنا اس نے نہ سیکھا ہے ، نہ اسے آتا ہے۔

خوں خوار خاں

نہیں[1] میں تو خدمت کے قابل جناب
پڑھا دیجیے گا تو ہوگا ثواب

مولوی (دل میں)

کہاں کا ثواب اور کہاں کا عذاب

(خوں خوار خاں سے)

اجی کچھ زر نقد کا ہو حساب

خوں خوار خاں

نہ خدمت میں ہرگز کروں گا کمی
میں چلمیں بھروں گا حضور آپ کی

مولوی (مطمئن ہوکر)

زیادہ تردّد نہ فرمائیے
بس اب آپ تشریف لے جائیے

(خوں خوار جاتا ہے)

۱- موٹی موٹی لفظیں (معقول و منقول معمول کنھ ملاؤں کی قرأت کے ساتھ) بولنے سے یہ فائدہ ہے کہ جہلا میں وقار بڑھے - مکتب کا معمول ماہواری کے دو چار آنہ ، جمعرات کا پیسہ ، عیدی کا ایک آنہ ، اس سے زیادہ کی امید خوں خوار ایسے کم حیثیت سپاہی سے مولوی کو نہیں ہو سکتی - خوں خوار خاں بے چارہ مولوی صاحب کو نہایت با خدا سمجھتا ہے ، ایسے مولوی اس کے دادا کے وقت میں ہوں تو ہوں ، اس زمانے میں بہت ہی کم ہیں - ثواب اور عذاب کے مسئلے کو مولوی صاحب خوں خوار خاں سے بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر اس پر عمل کرنا ان کے نزدیک ایسا ہی لغو ہے جیسا کہ وہ خوں خوار خاں کو سمجھتے ہوں گے - فاعتبروا یا اولی الابصار-

مولوی (طرّار سے مخاطب ہو کر)

بہت تم ہو بد ذات کیوں اے بچا!

طرّار

(مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر — چپکے سے)

بھلا تم سے کس نے کہا، اے چچا!

مولوی

(یہ سن کے نہایت غصے میں)

ابے دوں گا تجھ کو بہت گوشمال
طمانچوں سے منہ تیرا کر دوں گا لال

چچا کیوں کہا تو نے یہ تو بتا

طرّار (سہم کر چپکے سے)

نہ تھا قافیہ کوئی اس کے سوا

مولوی (تعجب سے)

تجھے قافیے میں بھی ہے دخل، بے!

طرّار (سبق یاد کرنے کے لہجے میں)

الف[1] سے بھلا پہلے کیسی یہ 'ب'

مولوی

بچا تم تو میرے بھی اُستاد ہو

طرّار (دل میں)

تو کیا اس میں کچھ شک بھی ہے آپ کو

۱- بھلا کا الف اور بے کی ی کو ذرا بڑھا کر کہنے سے لڑکوں کے سبق یاد کرنے کا لہجہ ہو جائے گا۔

پڑھائے ھیں میں نے کئی مولوی
بنائے ھیں میں نے کئی مولوی

مولوی (لڑکوں سے)

حقیقت میں یہ ھے بڑا بد نہاد
ذرا دیکھنا اس کی عقل فساد

(زھرہ ڈومنی اپنی چھوکری خیلا کو مکتب میں لے کے آتی ھے)

زھرہ

(کسی قدر تبسّم کے ساتھ)

مری عرض سن لیجے آخوند جی
یہ زھرہ ھے مجرے کو حاضر ھوئی

یہ ھے چھوکری میری خانہ خراب
دیا ھے اسے میں نے خیلا خطاب

(کسی قدر غرور کے لہجے میں جس سے کچھ طنز بھی پیدا ھو)

یہ چونڈے پہ میرے کرم کیجیے
ذرا اس کو شُد بُد پڑھا دیجیے

یہ علّامہ ھر بات میں طاق ھے
ابھی سے ھر اک فن میں مشّاق ھے

اگر چلبلاپن کرے کچھ یہاں
تو مارو اسے شوق سے قمچیاں

یہ آوارہ لونڈوں میں ھونے نہ پائے
ذرا مفت جوبن کو کھونے نہ پائے

کسی طرح کی مجھ میں وسعت نہیں

مولوی (دل میں)

پڑھانے کی بھی ہم کو فرصت نہیں

(زہرہ سے مخاطب ہو کر)

اجی واہ زہرہ! یہ کیا بات ہے
مگر اس میں اتنی ذرا بات ہے
شریفوں کی اولاد پڑھتی ہے یاں
خلاف ان کے گزرے گا یہ بے گماں

زہرہ

یہ[1] ذمہ مرا آپ اس کو پڑھائیں
کسی کا خطر اپنے دل میں نہ لائیں
بزرگوں سے ان سب کے ہوں آشنا
کریں گے بھلا عذر اس میں وہ کیا

(لیلٰی کی طرف اشارہ کرکے)

یہ لیلٰی جو بیٹھی ہیں صاحب تمیز
پدر کا ہے نام ان کے عبدالعزیز

(قیس کی طرف اشارہ کرکے)

بڑے بھائی ہیں ان کے سردار قوم
یہ بیٹے ہیں قیس ان کے سالار قوم

۱- قصد شاعر: زہرہ اور مولوی کی گفتگو سے اس امر کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ طوائف کو اس ملک کے نظام معاشرت میں کس درجہ مداخلت ہے۔

سدا ان امیروں میں جاتی ہوں میں
لڑکپن سے گاتی بجاتی ہوں میں

(طرّار کی طرف اشارہ کرکے)

مُؤا یہ جو لڑکا ہے دربان کا
مرے پاس باپ اس کا نوکر رہا

طرّار (دل میں)

یہ کہتی نہیں ہے مرا آشنا
حقیقت میں وہ ہے ترا آشنا

زہرہ (مولوی سے)

پڑھائیں اگر آپ اسے غور سے
میں خدمت کو حاضر ہوں ہرطور سے

(ایک اشرفی دکھا کر)

یہ لونڈی کا نذرانہ ہوئے قبول

مولوی (دل میں)

ہوئی اشرفی مفت میں اک وصول

(زہرہ سے مخاطب ہوکر)

فقط تھا اسی بات کا کچھ خیال
وگرنہ کروں عذر میں کیا مجال

پڑھاؤں گا خوب اس کو علم و ادب
کہ خدمت کوحاضر ہوں میں روز و شب

زهره (هنس کے)

یہ کہتی ہے بندی ابھی صاف صاف
اسے شب کی خدمت سے رکھیے معاف

سرِ شام آتے ہیں اُستاد جی
وہ کرتے ہیں تعلیم اسے موسقی

مولوی (قرأت سے لاحول پڑھ کے)

ہنسی کا یہ موقع یہ صحبت نہیں
یہ لڑکوں کا مکتب ہے خلوت نہیں

زهره (قہقہہ مار کے)

یہ کیا آپ نے مولوی جی کہا
نہیں عشق کے واسطے کوئی جا

مولوی (متبسّم ہو کے)

میں سنتا تھا تم کو کہ ہو خوش مذاق
ملیں آج بارے زہے اتّفاق

طرّار (دل میں)

یہ کہتے نہیں روز جاتے ہیں ہم
ہمیشہ مجیرے بجاتے ہیں ہم

(زهره جاتی ہے)

مولوی

ہوا ان بکھیڑوں میں یہ دن تمام
بس اب جاؤ لڑکو کہ ہے وقت شام

قیس (دل میں)

اے[1] معلّم! ابھی نہ دے رخصت
اور جی بھر کے دیکھ لیں صورت

مجنوں (ایک طرف ہوکر)

نہ مل یار سنگ دل سے نہ مل
دلا[2] کوئے دل رُبا میں نہ جا
الم ِ ہجر ، دردِ غم ہے ستم
خدا را مجھے بلا سے بچا
نہ کر قہر ، پھیر اُدھر سے نظر
بلا ہے بلا وہ زلف رسا
نہ دے غم مجھے خدا کے لیے

چوتھا سین — خواب گاہ قیس

(پہلی شب فرقت ۔ نالہ و زاری و بے قراری)

قیس

یا الٰہی[3] شب فرقت کی سحر ہو کہ نہ ہو
مجھ پہ بھاری ہے یہ شب ، آہ بسر ہو کہ نہ ہو

۱۔ صنف کلام : مطلع بحر خفیف وافی مخبون مسکن محذوف ۔ وزن : فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔ قصد شاعر : اس تمام صحبت کا اس شخص کے دل پر کیا اثر ہوا جس کا خیال ایک ہی طرف متوجہ رہا ۔

۲۔ صنف کلام : ابیات مثل مسمط چار خانہ ۔ بحر پارسی باربد یا یا جادو راہ ۔ وزن : مفاعیل فاع لات فعل ، ایک بار ۔ قصد شاعر : اظہار اس امر کا کہ مجنوں لیلیٰ کو دل دینے میں پس و پیش کرتا ہے ۔ اس کو حالت زود کہتے ہیں ۔

۳۔ صنف کلام : غزل بحر رمل وافی مخبون محذوف ۔ وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ، دوبار ۔ رُکن آخر (فعلن) بعض مصرعوں میں مسکن (بہ سکون عین) لیا گیا ہے ۔

درد فرقت سے مرے دم پہ بنی ہے یا رب
اس کو کچھ میرے تڑپنے کی خبر ہو کہ نہ ہو

نالے کرنے دے مجھے ہجر میں اے بے اثری!
دل کی حسرت تو نکل جائے اثر ہو کہ نہ ہو

ہم تو دیکھا کیے کل پیار کی نظروں سے انھیں
اب خدا جانے ادھر ان کی نظر ہو کہ نہ ہو

ہدف تیر نگہ ہیں جگر و دل دونوں
دردِ دل ہو کہ نہ ہو دردِ جگر ہو کہ نہ ہو

اب تو بے سمجھے ہوئے دل کا کیا ہے سودا
نفع کچھ ہو کہ نہ ہو اس میں ضرر ہو کہ نہ ہو

کل بھی اے دل تجھے لے جائیں گے ہم یار کے پاس
نذر دیں گے اسے منظور نظر ہو کہ نہ ہو

پانچواں سین ــــ مکتب خانہ

(قیس و لیلیٰ کا دوبارہ دو چار ہونا)

قیس (دل میں)

اللہ نے پھر آج وہی شکل دکھائی
پھر ہم کو وہی چاند سی صورت نظر آئی

لیلیٰ (دل میں)

وہ چشم وہ ابرو وہ اشارہ نظر آیا
لو آج بھی ہم کو وہی پیارا نظر آیا

مولوی (لڑکوں سے)

اب ؟ وقت سبق ہے آؤ لڑکو
سب اپنا سبق سناؤ لڑکو

لیلیٰ (معشوقانہ انداز سے)

'الف' ہے اک انوکھا حرف اسے اپنی ادا سمجھے
ہمارے بانکپن میں 'بے' ہے کیوں، ہم اس کو کیا سمجھے
تغافل 'تے' سے ہے اور 'ثے' سے ثابت ہے ثواب اس کا
جو سمجھے 'جیم' سے جلوہ تو 'حے' سے ہم حیا سمجھے
ہوئی 'خے' 'دال' سے اور 'ذال' سے ہم خود نما ایسے
کہ دیوانوں کی ذلت اور رسوائی روا سمجھے
ہوا 'یہ زا' و 'سین' و 'شین' سے اور 'صاد' سے حاصل
کہ زیب اور سادگی اور شرم کو صبر آزما سمجھے
کھلا یہ 'ضاد' و 'طا' و 'ظا' و 'عین' و 'غین' سے مضموں
ضیا طلعت کی سمجھے ظلم و عشوہ غم فزا سمجھے
ہوا یہ 'فا' و 'قاف' و 'کاف' و 'لام' و 'میم' سے روشن
فریب قتل سمجھے اور کرشمہ سہ لقا سمجھے
یہ 'نون' و 'واؤ' و 'ہا' و 'یا' سے ہم مطلب سمجھتے ہیں
کہ ناز و وصل و ہم خوابی کو ہم یوسف لقا سمجھے

مجنوں (عاشقانہ طرز سے)

'الف' سے ابتدائے الفتِ اہلِ ادا سمجھے
اسی کو ابتدا سمجھے اسی کو انتہا سمجھے
نہ سمجھے 'بے' سے کچھ ہم بے نوا لیکن بلا سمجھے
بری ہے بے وفائی عشق میں اس کو برا سمجھے

۱- صنف کلام : بیت بحر ہزج مجز و اخرب مقبوض محذوف ، وزن : مفعول مفاعلن فعولن ، دوبار -

نہ سمجھنے 'تے' سے ہم تفتہ جگر تاریک دل لیکن
تغافل تلخ تر ہے اس کو ہم ترکِ وفا سمجھے
یہ ہے 'ثے' کا اشارہ، عشق میں ثابت قدم رہنا
نہ سمجھے 'جیم' سے ہم کچھ مگر جور و جفا سمجھے
ہوئی 'حے' سے عیاں حیرت کہ جب ہے حسرت و حرماں
ہوئی 'خے' سے خرابی خود نمائی سے خدا سمجھے
دلِ دیوانہ سمجھا 'دال' سے اک درد کا پہلو
نہ سمجھے درد کو ہم کچھ مگر دل کی دوا سمجھے
جو ذلت 'ذال' سے سمجھے تو 'رے' سے سمجھے رنجوری
نہ سمجھے 'زے' کو لیکن زخم اور زحمت فزا سمجھے
ستم ہے 'سین' سودا 'شین' ہے شور و شغب بالکل
جو سمجھے 'صاد' صحرا کو تو ہم صبرآزما سمجھے
ضلالت 'ضاد' سے ہے 'طوئے' سے ہے طوق گردن کا
نہیں ہے 'ظوئے' لیکن ظلم اسے ظلمت نما سمجھے
اگر ہے 'عین' عینِ عشق تو ہے 'غین' غینِ غم
جو 'فے' کو ہم فنا تو 'قاف' کو اپنی قضا سمجھے
نہیں ہے 'کاف' جز کاکل نہیں ہے 'لام' جز لیلیٰ
کبھی لب اس کو سمجھے اور کبھی زلفِ رسا سمجھے
مزا ہے 'میم' سے مرنے کا اور ہے 'نون' ناکامی
وفا کو 'واؤ' سے اور 'ھے' سے ہم ھائے ھوا سمجھے
یہ حرف 'یا' جو ہے دوبار نامِ یار میں آیا
نہ سمجھے اس کو ہم آخوند جی بتلاؤ کیا سمجھے

مولوی

''خوب سمجھے۔ میاں طرّار! تم تو ذرا اپنا سبق سناؤ اور تیزیٔ طبع کے جوہر دکھاؤ''

طرّار

بتا دیں ہم 'الف ، بے' سے جو کچھ اچھا برا سمجھے
بھلائی کو برا سمجھے برائی کو بھلا سمجھے

مولوی

''چپ چپ ، خاموش خاموش ! بی خیلا صاحبہ آپ کیا سمجھیں؟''

خیلا (اٹک اٹک کر)

'الف'[۱] سے اپنی آنکھوں کی قسم میں آشنا سمجھی
اور اس 'بے' سے جو بے زر ہو تو پھر بالکل بلا سمجھی

مولوی (خیلا سے مخاطب ہوکر) ''تم خوب سمجھیں''

(سب لڑکوں سے)

سنو[۲] لڑکو! نہیں اب کچھ مرا کام
میں گھر جاتا ہوں ہے یہ وقت آرام
نہ ہونے پائے مکتب میں شرارت
سبق تم یاد کرنا با فراغت

۱- قصد شاعر : اظہار وضع خیلا - یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ مولوی کو لیلیٰ اور مجنوں اور طرار اور خیلا کے وضع اور ارادے کے سمجھنے کا بہت اچھا موقع حاصل تھا ، مگر پھر بھی وہ اس پر متنبہ نہ ہوا ، یا وہ متنبہ ہوا تو اس نے اپنے فرض کے پورا کرنے میں کمی کی - اس شعر کی ردیف میں یاے مجہول کو عمداً یاے معروف میں بدل دیا ہے اور لطف اس کا ظاہر ہے -

۲- صنف کلام : مثنوی (مرقع) بحر ہزج مخز و مقصور یا محذوف - وزن : مفاعیلن مفاعیان فعولان دوبار ، یا بجائے فعولان کے فعولون قصد - شاعر : اظہار غلطی مولوی - جہاں اس قسم کے لڑکے پڑھتے ہوں ان کی زیادہ حفاظت چاہیے ، نہ یہ کہ مولوی مکتب کو ان کی شرارت کے سپرد کر کے خود آرام میں مشغول ہو - ایسی غلطیاں ہمارے دیسی مکتبوں میں بہت ہوا کرتی ہیں اور اس کی اصلاح کی طرف نظر کرنا ان لوگوں کا فرض ہے جن کے پیارے بچے ان مکتبوں میں تعلیم پاتے ہیں -

جو بھولے کوئی تو اس کو بتانا
جو تم میں ہیں نئے ان کو پڑھانا
کریں سب تختیاں دھو دھا کے فرصت
الف بے کوئی لکھے کوئی بابت

(مولوی صاحب یہ کہہ کے جاتے ہیں، میاں طرّار کسی بہانے سے علیحدہ آتے ہیں)

طرّار

گئے آخوند جی ہے وقت مہلت
بس اب مکتب سے میں ہو جاؤں چمپت

لڑکے (طرّار کے پیچھے دوڑ کے)

کہاں جاتا ہے اے طرّار فرار؟
ترے سر پر ہم آ پہنچے خبردار!

خیلا (تھوڑی دور جا کے پھر آتی ہے)

(دل میں)

گئے طرّار کو سب تو پکڑنے
مگر یہ قیس و لیلیٰ کیوں نہ اٹھے
جو کچھ آپس میں یہ باتیں کریں اب
یہاں سے ہم کھڑے ہو کر سنیں سب

لیلیٰ (خوب چلا چلا کے)

'الف' اللہ کی نشانی ہے
بندگی اس کی 'بے' سے جانی ہے

مجنوں

کتاب[1] دیکھ چکیں اب ذرا ادھر دیکھو
حجاب دے جو اجازت تو اک نظر دیکھو

۱- صنف کلام: غزل مسلسل (یا مرقع یا خطابی) بحر مجتث وافی مخبون مشعث محذوف۔ وزن: مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن دوبار۔ قصد شاعر: اظہار عشق و تمنا۔

کسی کا خون نہ کرے یہ نگاہ بے پروا
کسی کی جان نہ لے چشم فتنہ گر دیکھو
لگاؤ باد ہوائی نہ تیر نظروں کے
نشانہ تاک لو میرا دل و جگر دیکھو
کسی کے دم پہ بنی ھے یہ بے رخی کب تک
خدا کے واسطے لیلٰی ذرا ادھر دیکھو

لیلٰی

کوئی[1] بتائے کہ ھم کیوں بھلا ادھر دیکھیں
بلا کو اپنی غرض کیا جو اک نظر دیکھیں
یہ تیر کیا یہ نظر کیا، نہیں سمجھتے ھم
جو کچھ بھی ھو تو کسی کا دل و جگر دیکھیں
یہ چھیڑ چھاڑ کی باتیں ھمیں نہیں بھاتیں
ھے جھانک تاک سے نفرت ھمیں، کدھر دیکھیں

(طنزیہ التجا کرکے دست بستہ)

نہ ایسی باتیں زباں پر پھر آنے پائیں کبھی
خدا کے واسطے صاحب، ذرا ادھر دیکھیں

مجنوں

نگاہ قہر سہی دیکھ تو لیا تم نے
ھمارے جذبۂ دل کا ذرا اثر دیکھو

۱- قصد شاعر: اظہار انداز معشوقانہ حجاب کے ساتھ - لیلٰی کے انداز معشوقانہ سے عاشقی کی ادا بھی نکلتی ھے ور یہ مصرع اس پر شاھد ھے: "جو کچھ بھی ھو تو کسی کا دل و جگر دیکھیں" لیلی کو اپنی رسوائی کا بھی حد سے زیادہ خیال ھے اور ایک شریف زادی کو ھونا چاھیے -

لیلیٰ (کھسیانی ہو کے)

یہ تم نے خوب کہی! خیر جو ہوا سو ہوا
قسم لو ہم سے جو اب تم کو عمر بھر دیکھیں

(خیلا آتی ہے)

خیلا (قیس سے مخاطب ہو کے)

یہ کیسی باتیں ہیں صاحب ذرا ادھر دیکھو
تمام شہر میں کر دوں گی میں خبر دیکھو

(لیلیٰ سے مخاطب ہو کے)

تمھاری ماں سے میں کہتی ہوں جا کے اے لیلیٰ!
نہ آنے پاؤ گی مکتب میں عمر بھر دیکھو

(دل میں)

سمجھ کے لائیں تھیں بیوی پھنسے گا ہم سے قیس
فدا وہ دل سے ہوا اس کمینی پر دیکھو

(لڑکے مع طرّار آتے ہیں)

(سب لڑکوں سے مخاطب ہو کے)

امیر زادیاں جب مفت میں کریں یاری
تو ہم غریبوں کی ہو کس طرح بسر دیکھو

طرّار

(خیلا سے، اپنی طرف اشارہ کر کے)

جو باتیں کرتے ہیں آپس میں قیس اور لیلیٰ
تمھیں ملال ہے کس بات کا، ادھر دیکھو!

چھٹا سین ـــ محل سرائے عبدالعزیز

(کمرۂ نشست مادرِ لیلٰی)

(زہرہ آتی ہے)

زہرہ

(مادرِ لیلٰی سے مخاطب ہو کر)

مجرا[1] ہو مرا قبول بیگم
ہوں مطلبِ دل حصول بیگم !

بیگم

زہرہ کدھر آئیں کیا خبر ہے ؟
نسبت کوئی لائیں کیا خبر ہے ؟

زہرہ

نسبت کا نہ پوچھو حال بیگم
کس کو نہیں یہ ملال بیگم
اس وقت کے سب امیر زادے
شہزادے ہوں یا وزیر زادے
آوارہ مزاج ہو گئے ہیں
مفلس محتاج ہو گئے ہیں
ورثے کی آمید پر جو لیں قرض
جورو کا ادا کریں گے کیا قرض

۱- صنف کلام : مثنوی (مرقع) بحر ہزج مجز و اخرب مقبوض مقصور یا محذوف ـ وزن : مفعول مفاعلن فعولن یا فعولان ، قصد شاعر : اظہار طرز معاشرت (بعض) رؤسائے اہل اسلام ـ اگر زہرہ ڈومنی ہے تو اس کی آمدورفت زنانہ میں قابل اعتراض نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسی ڈومنیاں اکثر پردہ نشین ہوتی ہیں لیکن زہرہ پردہ نشیں نہیں ہے جیسا کہ اس کے مکتب میں جانے سے ظاہر ہے ـ

مرنا ماں باپ کا جو چاہیں
بی بی سے موئے وہ کیا نباہیں

اللہ کا ڈر نہیں ہے ان کو
کچھ خوف و خطر نہیں ہے ان کو

جلسوں میں شراب پی کے جانا
میلے ٹھیلوں میں غل مچانا

اچھے لوگوں سے ان کو نفرت
شہدے گرگوں سے ان کو صحبت

سیکھے کرنی نوج ان کا شیوہ
ہے گالی گلوچ ان کا شیوہ

تاکیں جو رنڈیوں کا گہنا
کیا ان سے کسی کو ہوگا لہنا

کچھ شرم انہیں نہ کچھ حیا ہے
پھر ان سے کہو امید کیا ہے

بیگم

زہرہ سچ کہتی ہے تو بالکل
اس گھر کا چراغ بھی ہے اب گل

وہ قیس جو ہے مرا بھتیجا
وہ جیٹھ کا میرے ہے جو بیٹا

اب کیا کہوں فخر خانداں ہے
یوں تو وہ جگر ہے میری جاں ہے

اطوار برے ہیں اس کے زہرہ
آثار برے ہیں اس کے زہرہ

کس ناز و نیاز سے پلے ہیں
اپنی اماں کے لاڈلے ہیں

کہتی نہیں میں یہ کچھ ہنسی سے
خدمت میں لونڈیاں ابھی سے

ہر چند نہیں یہ کہنے کی بات
کیا منہ سے کہوں کہ ہے بری بات

دن رات ہے آن سے پیار اخلاص
اک بات ہے آن سے پیار اخلاص

یہ لاڈ کبھی سنے ، نہ دیکھے!
یہ کھیل تو کھیلتے نہ دیکھے

یوں ناز آٹھائیں جبکہ ماں باپ
بچے ہوں خراب آپ سے آپ

زھرہ

کیا بات کہی ہے واہ بیگم!
ہاں بات یہی ہے واہ بیگم!

لیکن اک بات پوچھتی ہوں
تقصیر معاف ہو تو پوچھوں؟

دانا ہو کر بنی ہو نادان
صاحب زادی کا کچھ نہیں دھیان

ہر چند کہ ھیں ابھی وہ کم سن
مکتب میں بھی جانے کے نہیں دن

نکلی کم بخت بات میں بات
اور بات بھی وہ جو ہے خرافات

مکتب بھی وہ جس میں قیس جائیں
عشق الدین جہاں پڑھائیں

اول تو برا وہ مولوی ہے
دیہاتی موا وہ مولوی ہے

باتوں کا نہیں ہے جسے سلیقہ
کیا جانے پڑھانے کا طریقہ
اب آگے نہ کچھ کہے گی بندی
عاقل کو ہے اشارہ کافی
لڑکوں میں لڑکیوں کا پڑھنا
ہم نے تو کبھی سنا نہ دیکھا
حرمت کا بھی کچھ تمہیں نہیں ڈر
بن بیاہی کو بھیجتی ہو باہر

بیگم

زہرہ سچ کہتی ہے تو بے شک
مجھ کو نہ تھا اس کا دھیان اب تک
لیلٰی خیر آج تو گئی ہیں
اب جانے نہ دوں گی حشر تک میں
پڑھنے کا بہت ہے ذوق اس کو
ہے شعر و سخن سے شوق اس کو
آ تو رکھنہ لوں گی دونی گھر پر
اب جانے نہ دوں گی اس کو باہر
(زہرہ جاتی ہے، لیلٰی آتی ہے)

بیگم

لیلٰی مکتب میں اب نہ جانا
منظور نہیں مجھے پڑھانا
لیلٰی (ماں سے مخاطب ہو کر)
جو آپ کہیں وہی ہے بہتر
(دل میں)
ہر چند کے ہو وہ شاق دل پر

ساتواں سین ـــــ خواب گاہ لیلٰی

لیلٰی

قیس[1] پیارے اب ترا ملنا مجھے دشوار ہے
باپ ماں کی قید سے لیلٰی بہت ناچار ہے
کہتی تھیں اماں تری نسبت کے آتے ہیں پیام
اب کہوں کس سے کہ شادی سے مجھے انکار ہے
یا الٰہی ! قیس کے ساتھ آئے نسبت کا پیام
پھر نہ اُس میں عذر ہے مجھ کو نہ کچھ تکرار ہے
زہر کھا لیتی نہ ہوتی گر ترے ملنے کی آس
ان دنوں کچھ زندگی سے جی مرا بیزار ہے
ہائے رہ رہ کے کلیجے میں مرے اٹھتا ہے درد
عشق کہتے ہیں جسے کیا وہ یہی آزار ہے

آٹھواں سین ـــــ مکتب خانہ

(قیس مکتب میں آتا ہے ، لیلٰی کو نہ دیکھ کر گھبراتا ہے)

قیس (دل میں)

اے چرخ ستم پیشہ یہ کیا چال ہے تیری
مکتب میں نہ کیوں آج وہ طلعت نظر آئی

آخوند

اے قیس کہو تن ہے کہاں جان کدھر ہے
مکتب میں تو بیٹھے ہو مگر دھیان کدھر ہے

۱- صنف کلام : غزل مسلسل بحر رمل وافی محذوف - وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ، دوبار - قصد شاعر : اظہار حالت مجبوری و عشق -

(قیس کے پاس جا کے)

کیوں روتے ہو کیا دکھ ہے تمھیں؟ منہ سے تو بولو

(دھمکا کے)

بے مار کی توبہ! --------

(طمانچہ مار کے)

-------- چلو اب خوب سا رو لو

قیس (گریۂ بے اختیار)

قیس (دل میں)

ہم نے تو نہ کھائی تھی کبھی سیلئی اُستاد
اے حضرتِ عشق! آج یہ پہلی ہوئی اُفتاد

طرّار

آخوند جی صاحب خبر اُس کی تمھیں کیا ہے
لیلئی نہیں آئیں وہیں دل اُن کا لگا ہے

خیلا (مجنوں سے)

ہم سنتے ہیں پردے میں بٹھائی گئیں لیلئی
تا حشر تو مکتب میں اب آتی نہیں لیلئی

آخوند

لو آج کھلا، واہ! بڑا کام کروگے
کیا قصد ہے صاحب مجھے بدنام کروگے؟
آوارہ مزاجوں کا پڑھانا نہیں اچھا
بس جائیے یاں آپ کا آنا نہیں اچھا

قیس (دل میں)

مکتب[1] سے نکالے گئے اب منہ کسے دکھلائیں
اے حضرت دل ! آؤ کہیں اور نکل جائیں

نوانِ سِن ـــــ درِ مکتب

حضرت دل ! کہیے اب کیا آپ کا ارشاد ہے
آپ کے قابو میں اب یہ بندۂ آزاد ہے

پھر چلوں مکتب کو یا فرمائیے گھر کو چلوں
باپ کا ڈر ہے وہاں یاں سیلئی اُستاد ہے

شوق کہتا ہے کہ چلیے کوئے جاناں کی طرف
گو کہ یہ عینِ مرادِ خاطرِ ناشاد ہے

اپنی رسوائی کا ڈر ہے اُس کی بدنامی کا خوف
بد گمانی ہے وہاں اور خنجر بے داد ہے

مے کدے کو چلیے گر ہو بے خودی کی آرزو
بُت کدے کو چلیے گر اُس بت کی جی میں یاد ہے

۱- صنف کلام : غزل مسلسل (مرقع یا خطابی ، یہاں خطاب نفس یا دل سے) قصد شاعر : اظہار حالت انتشار ، ایک بڑی بات کا قصد تو کر لیا ہے مگر انجام دینے میں جو مشکلات در پیش ہیں ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے طبیعت کوشش کرتی ہے ، ایسی حالت بیشتر اس وقت طاری ہوتی ہے جب کہ انسان کسی امر عظیم کے اقدام کا قصد کرے ؛ مثلاً خود کشی یا قتل عمد ۔

مجنوں ابھی کم سن ہے ، اُس کو گھر سے بھاگنا نہایت دشوار ہے ۔ مانا کہ اس کو مکتب سے نکالے جانے کی بڑی شرم ہے ، وحشت عشق اور بھی شہ دے رہی ہے مگر پہلے پہل گھر سے نکلنا بھی آسان نہیں ہے ۔

کوچہ گردی ہو ، اگر ہے سنگ طفلاں کی ہوس
سیر گلشن ہو جو ذوق نالہ و فریاد ہے
چلیے صحرا کو جو ہو سایہ ببولوں کا پسند
چلیے زنداں کو جو شوقِ زیورِ فولاد ہے

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ تیسرا

پہلا سین ــــ دیوان خانہ

عبداللہ (دل میں)

کیا ہوا[1] قیس اب تک نہ آیا
اس میں اسرار کیا ہے خدایا

(نوکروں سے)

کوئی آخوند کے پاس جائے
کیا سبب ہے ذرا پوچھ آئے

(ایک ملازم طرّار کو لے کے حاضر ہوتا ہے)

ملازم

یہ جو لڑکا ہے طرّار نامے
یہ بھی پڑھتا ہے مکتب میں آن کے
آپ سے کچھ کہا چاہتا ہے

عبداللہ

ہاں بتا جلد ، کیا چاہتا ہے؟

۱- صنف کلام : مثنوی (خطابی) بحر متدارک وافی اخذ - وزن : فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن فع - قصد شاعر : اظہار تشویش -

طرّار

مجھ کو بھیجا ہے آخوند جی نے
اور کہا ہے یہ کہہ دینا آن سے

قیس نے کی تھی یاں کچھ شرارت
اس لیے حسبِ ارشادِ حضرت
میں نے اک ان کو مارا طمانچا
اس پہ کچھ آن کو آیا جو تپا

چل دیے اٹھ کے مکتب سے گھر کو
اس پہ لازم ہے تنبیہ کچھ ہو
رعب میرا نہیں مانتے وہ
مجھ کو اصلا نہیں مانتے وہ

ورنہ ان کا پڑھانا ہے مشکل
آن کا مکتب میں لگتا نہیں دل

عبداللہ

شوق سے وہ تو جاتا تھا مکتب
کیا سبب دل نہ لگنے کا ہے اب

طرّار

اس کا حال آپ پوچھیں نہ مجھ سے

عبداللہ

سچ بتا پوچھتا ہوں میں تجھ سے !

طرّار

وہ سنیں گے تو ماریں گے مجھ کو

عبداللہ

مار کا اس کے کیا ڈر ہے تجھ کو

پوچھتا ہوں میں تجھ سے خبردار
سچ بتا ورنہ تو جان طرّار!

طرّار

خیر سن لیجیے حال حضرت
ان کو لیلیٰ سے تھی کچھ محبت

پیار اخلاص ہوتے تھے دن بھر
چھپ کے جاتے تھے یہ ان کے گھر پر

گزرے ان باتوں کو دو مہینے
کہہ دیا اُن کی ماں سے کسی نے

سنتے ہیں وہ نہ آئیں گی مکتب
جی لگے ان کا مکتب میں کیوں اب

عبداللہ

چل بے چل دور ہو تو یہاں سے
اب نہ نکلے کبھی یہ زباں سے

(دل میں)

اچھی صورت پہ ہے قیس مائل
کیا عجب ہے جو یہ سچ ہو اے دل!

دوسرا سین — کوچہ و بازار، دشت و کوہسار

(عبداللہ قیس کو تلاش کرتا ہے)

عبداللہ

کیا ہوا[1] قیس پیارا ہمارا
کیا ہوا وہ دلارا ہمارا

(مجنوں کے تصور سے مخاطب ہو کر)

گھر میں آئے نہ مکتب سے پھر کر
غم ہوا کیوں گوارا ہمارا

(آسمان سے مخاطب ہو کر)

اے فلک! تو ہی بتلا دے ہم کو
کیا ہوا ماہ پارا ہمارا

باپ دکھیا کہاں جاکے ڈھونڈے
کیا ہوا وہ ستارا ہمارا

زیست اپنی ہے بس اس کے دم تک
ہے وہی اک سہارا ہمارا

(مجنوں کے تصور سے مخاطب ہو کر)

تم ادھر ہم ادھر گھر سے نکلے
گھر ہی بگڑا تمہارا ہمارا

۱- صنف کلام غزل مسلسل (خطابی)- بحر و وزن کے لیے دیکھو حاشیہ صفحہ گزشتہ - قصد شاعر: اظہار محبت پدری -

لو قسم ہم سے گر کچھ کہیں ہم
مانو کہنا خدا را ہمارا

ایک راہ گیر

دیکھ تو وہ نہ ہو تیرا بیٹا

عبداللہ

وہ پسر ہے ہمارا ہمارا

(مجنوں سے مخاطب ہو کر)

تیرا[1] کیا حال ہے جان بابا
کیا برا حال ہے جان بابا

کیوں خفا ہو گئے ہم سے بیٹا
کیوں جدا ہو گئے ہم سے بیٹا

کیا جنوں تیرے سر میں سمایا
باپ ماں کا نہ کچھ دھیان آیا

تجھ سے تھا زندگی کا سہارا
تو نے کیوں جیتے جی ہم کو مارا

۱- صنف کلام : مثنوی (خطابی یا مرقع) اظہار محبت پدری عبداللہ کی طرف سے ، شرم و حجاب قیس کی طرف سے - عبداللہ اظہار کرتا ہے کہ جس مطلب کے لیے تو گھر سے نکلا وہ میرے امکان میں تھا ؛ قیس اپنے مطلب کی بات باپ کی زبانی سن کر اپنے آنے سے پشیمان ہے - قیس اپنے باپ سے عشق لیلیٰ کو اظہار نہیں کرتا - وہ جانتا ہے کہ باپ اس سے خود ہی واقف ہے ، پھر میں کیوں بے شرم ہو کر اپنا جوش ظاہر کروں - قیس صرف عفو تقصیر کا طالب ہے اور اپنے باپ کے ساتھ گھر چلنے پر بالکل راضی ہے اس لیے کہ اسے وصل محبوب کی امید دی گئی ہے -

یہ سمائی ترے دل میں کیسی
کیا مصیبت پڑی تجھ پہ ایسی

رنگ چہرے کا ھے زعفرانی
جو کبھی آگے تھا ارغوانی

پیرہن چاک ھے تا بہ دامن
پاؤں پر خاک ھے تا بہ دامن

آہ و زاری ھے اور بے قراری
سینہ کوبی ھے اور اشک باری

آہ جنگل میں پایا نہیں کچھ
تو نے کے دن سے کھایا نہیں کچھ

ہم نے مانا کہ بے تاب تھا تو
رنج سے بے خور و خواب تھا تو

ہم سے کیا شرم تھی تجھ کو ایسی
بیٹیاں کہہ گزرتی ھیں جی کی

دل ھی دل میں عبث رنج سہتا
اپنے ہم جولیوں سے تو کہتا

کچھ نہ کچھ اس کی تدبیر کرتے
ہم تو اک دن نہ تاخیر کرتے

میرے بھائی کی بیٹی ھے لیلی
ہر طرح تجھ کو ھے وہ پہنچتی

کیا چچا تیرا انکار کرتا ؟
بیٹی دینے میں تکرار کرتا ؟

گھر ترا ہم تو آباد کرتے
کرکے شادی تجھے شاد کرتے

مجنوں

مجھ سے بے شک ہوئی یہ حماقت
زندگی بھر رہے گی خجالت

گھر میں جانے کے قابل نہیں میں
منہ دکھانے کے قابل نہیں میں

حکم تعزیر فرمائیے اب
عفوِ تقصیر فرمائیے اب

عبداللہ

اس میں کیا تیری تقصیر پیارے
یہ بھی تھا حکم تقدیر پیارے

اس بڑھاپے میں یہ دکھ اٹھاؤں
ٹھوکریں کوہساروں میں کھاؤں

جو ہوا اس پہ اب خاک ڈالو
ساتھ میرے چلو اپنے گھر کو

چل کے شادی رچاؤں تمھاری
اب دلھن بیاہ لاؤں تمھاری

تیسرا سین۔ دیوان خانۂ عبدالعزیز پدرِ لیلٰی

(عبداللہ مجنوں کے لیے لیلٰی کی خواستگاری کو جاتا ہے)

عبداللہ

مری[1] التجا تم سنو چھوٹے بھیّا
غلامی میں لو قیس کو چھوٹے بھیّا

۱۔ صنف کلام مثنوی (خطابی) بحر متقارب وافی سالم۔ وزن: فعولن فعولن فعولن فعولن دوبار۔ قصد شاعر: ایک صورت اس گفتگو کی جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتی ہے۔

نہ اب قیس میرا نہ لیلٰی تمہاری
یہ بیٹا تمہارا وہ بیٹی ہماری

خدا نے دیا عمر بھر میں یہ بیٹا
یہ سمجھو تو ہے سارے گھر میں یہ بیٹا

یہی ہے ریاست کا مختار بھائی
یہی قوم عامر کا سردار بھائی

عبدالعزیز

بجا ہے یہ ارشاد اے بھائی صاحب!
سوا اس کے اب کون ہے بھائی صاحب

یہ نسبت بہت روز سے دل نشیں ہے
مگر کیا کروں میرا قابو نہیں ہے

نہیں ماں کو لیلٰی کی منظور بھائی
اسی سے ہوا میں بھی مجبور بھائی

کئی بار یہ تذکرے آ چکے ہیں
ہر اک طرح سب اس کو سمجھا چکے ہیں

نہیں مانتی وہ کسی کا بھی کہنا
بس اب اس میں لازم ہے خاموش رہنا

عبداللہ

یہ تکرار تم کو مناسب نہیں ہے
یہ انکار تم کو مناسب نہیں ہے

یہ سمجھو کہ پاس قرابت بھی ہے کچھ
قرابت نہ سمجھو حمیّت بھی ہے کچھ

بڑے بھائی کی التجا کو تو مانو
نہ مانو کسی کو خدا کو تو مانو

نہیں ایسے ، بھابھی کے کہنے میں ہو تم
جو ہو بات دل میں وہ منہ سے کہو تم

اگر مہر پر کچھ ہو تکرار بھائی
تو ہر طرح سے ہوں میں تیّار بھائی

مرا مال و املاک دولت لکھا لو
مری جائداد اور ریاست لکھا لو

عبدالعزیز

زیادہ نہ محجوب فرماؤ بھیّا
نہیں اس کی ماں کو یہ منظور اصلا

بغیر اس کی مرضی کے ممکن نہیں ہے
کسی طرح یہ مجھ سے ممکن نہیں ہے

نہ کچھ باغ سے ہم کو مطلب نہ گھر سے
نہ کچھ مال سے ہم کو مطلب نہ در سے

کسی طرح سے بھی جو منظور ہوتا
تو کچھ مہر کا اس میں مذکور ہوتا

عبداللہ

نہ منظور ہونے کا آخر سبب کیا ؟
وہ مطلب نہیں ہے تو پھر ہے طلب کیا ؟

تو کچھ ہے برائی حسب اور نسب میں
لحاظ اس کا ہوتا ہے قوم عرب میں

عبدالعزیز

نہیں ذات میں بھی کسی طرح کم تم
کہ ہیں ایک دادا کی اولاد ہم تم

نہیں کچھ حسب اور نسب میں برائی
کہ آخر جو تم ہو وہی ہم ہیں بھائی

عبداللہ

کسی طرح کی جب نہیں ہے برائی
نہ یہ ہے نہ وہ ہے تو پھر کیا ہے بھائی؟

بس اب وجہ انکار تم صاف کہہ دو
جو آئی ہو دل پہ آسے منہ پہ رکھو

بھلا فائدہ کیا ہے اس گو مگو سے
مرا دم الجھتا ہے اس گو مگو سے

عبدالعزیز

نہ کہوائیے صاف اب مجھ سے حضرت
کہ یہ امر ہوگا خلاف طبیعت

اگر قیس کے ہوتے اطوار اچھے
و یا پائے جاتے کچھ آثار اچھے

بھتیجے کے ہوتے کسے بیٹی دیتا
'نہیں' کا کبھی نام بھی میں نہ لیتا

نہیں بات میں اس کی سنجیدگی کچھ
طبیعت میں ہے اس کی شوریدگی کچھ

کیا میری بیٹی کو رسوا، یہ کیا تھا
مجھے تو کہیں کا نہ رکھا، یہ کیا تھا

یہ بےہودہ سودا جو سر میں سمایا
بزرگوں کا بھی دھیان دل میں نہ آیا

چچا کی یہ حرمت ہے ، یہ بھی نہ سمجھا
گھرانے کی عزت ہے ، یہ بھی نہ سمجھا

سمجھیے اگر تو یہ صدمہ نہیں کم
یہی نا ، بھتیجا تھا چپ ہو رہے ہم

ابھی سے جو یہ عاشقی کا مزا ہے
تو پھر آگے چل کر خدا ھی خدا ہے

یہ آوارگی ہو طبیعت میں جن کی
بھلا اُن کو کس طرح دے کوئی بیٹی

عبداللہ

عبث قیس سے تم کو ہے بد گمانی
مناسب نہیں ہے یہ نا مہربانی

محبت بھی ہے کوئی تقصیر بھائی
اگر ہو تو کیا اُس کی تعزیر بھائی

محبت بھی وہ ، پاک ہو جو محبت
کہ بچوں کو ہوتی ہے ایسی ھی اُلفت

چوتھا سین ۔ دیوان خانۂ عبداللہ

(عبداللہ قیس کو خبر مایوسی سناتا ہے)

عبداللہ

ھائے[1] کیا حال ھوا غم سے تمھارا ، اے قیس!
دھیان لیلیٰ کا بس اب چھوڑو خدا را ، اے قیس!

۱۔ صنف کلام ۔ غزل خطابی ۔ بحر رمل وافی مخبون مسکن مقصور یا محذوف ۔ وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان دوبار اور رکن آخر جہاں محذوف ہے، فعلن ۔ قصد شاعر : اظہار مایوسی کے ساتھ تسلّی دینا ۔

کتنا سمجھایا کیے ہم پدر لیلیٰ کو
پر نہیں مانتا کہنا وہ ہمارا اے قیس!
رحم ہے دل میں نہ کچھ خوف خدا ہے اس کو
ہے چچا کو ترا سب رنج گوارا اے قیس!
چھوٹے بھائی نے نہ مانا مرا کہنا افسوس
مجھ کو ہم چشموں کی نظروں سے اتارا اے قیس!
اس کی بیٹی پہ ہے کیا زور ہمارا بیٹا
تو تمھی کہہ دو کہ کیا بس ہے ہمارا اے قیس!
کیا کمی تم کو کہ ہیں اور حسیں ایک سے ایک
دھوم سے کرتے ہیں اب بیاہ تمھارا اے قیس

قیس

تذکرہ[1] اس کا نہ اب کیجیے آپ اے بابا!
دل کو صدمہ نہ مرے دیجیے آپ اے بابا!
مجھ کو شادی سے سروکار نہیں ہے بالکل
نام بھی اس کا نہ اب لیجیے آپ اے بابا!
رسم شادی کی تو آئین محبت میں نہیں
ذکر اس بات کا کیا جو مری قسمت میں نہیں
چھوڑ دو مجھ کو مرے حال پہ اب اے بابا!
تم یہ سمجھو کہ یہ تھی مرضئ رب اے بابا!
ایسے بیمار تو دیکھے نہیں اچھے ہوتے
میری تقدیر میں ہے رنج و تعب اے بابا!
میں وہ بیمار ہوں جینے کی مرے آس نہیں
جز غم و یاس کوئی آس کوئی پاس نہیں

۱- ترکیب بند ، بحر رمل واقی مخبون مسکن مقصور یا محذوف - وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن (یا فعلان) دوبار - قصد شاعر : اظہار یاس و غم حجاب کے ساتھ -

(دل میں)

دم قدم سے مرے آباد ہے ویرانۂ غم
میرے باعث سے ہوئی رونق کاشانۂ غم
مجھ کو شادی نہیں منظورکہ غم دوست ہوں میں
کوئی دن زیست کے ہیں میں ہوں اور افسانۂ غم
ہاں خوشی یہ ہے کہ میری اجل آنے کو ہے
اب تو کچھ دیر نہیں آج کل آنے کو ہے

(عبداللہ و ملازم جاتے ہیں ، قیس کا دوبارہ صحرا کو چلے جانا)

(دل میں)

شوق کہتا ہے کہ چل کوچۂ جاناں کی طرف
یاس کھینچے لیے جاتی ہے بیاباں کی طرف

(نہایت اضطرار میں)

کیسی آفت میں مقدّر نے پھنسایا ہے مجھے

(گریبان پھاڑ کر)

ہاتھ کیوں کر نہ بڑھے میرا گریباں کی طرف

(آہستہ آہستہ چلنا)

راستہ دشت کا اے وحشت دل ! تو ہی بتا
کس کے کہنے پہ چلوں حسرت دل تو ہی بتا
راستہ تو ہی بتا دے مجھے اے حیرت دل !
کوچۂ یار میں لے چل تو ہی اے حسرت دل !

(ذرا ٹھہر کے) ۔

کیوں نہ ہو پاس مجھے یار کی رسوائی کا

(پھر جلد جلد قدم اٹھا کے)

وادیٔ نجد میں لے چل مجھے اے وحشت دل !

اکثر آتی ہے وہاں کوچۂ لیلیٰ کی ہوا
اور لے جائے کہاں کوچۂ لیلیٰ کی ہوا

پانچواں سین — خواب گاہ لیلیٰ

لیلیٰ

اے[1] فلک دل دکھانا ہے برا ، آہ
دیکھ ہم کو ستانا ہے برا ، آہ

قیس کے وصل سے آج ہوئی یاس
عمر بھر کا چھڑانا ہے برا ، آہ

بے گنہ تو رلاتا ہے مجھے ، ہائے !
دیکھ ظالم رولانا ہے برا ، آہ

(کفِ افسوس مل کے)

دل کے پیچ میں آئی میں صد افسوس
آہ پیچ میں آنا ہے برا ، آہ

کیوں دیا دل ، یہ کیا قہر کیا ، ہائے !
اب کھلا دل لگانا ہے برا ، آہ

غم کی آگ میں جلتی ہوں میں افسوس
مثل شمع ---------------

(آسمان کی طرف دیکھ کے)

-------- جلانا ہے برا ، آہ

۱- صنف کلام : غزل مسلسل بحر مشاکل وافی مکفوف مقصور - اور بعض مصرعوں مثلاً مصرع اول (مطلع) میں رکن اول سالم سے لیا ہے ، یعنی فاع لاتن - وزن : فاعلاتن مفاعیل فعولان - قصد شاعر : اظہار حالت یاس و غم و مجبوری -

آہ رو بھی نہیں سکتے کہ ہیہات
روئیں کیوں کر زمانہ ہے برا ، آہ

چھٹا سین ــــ وادیٔ نجد

مجنوں (خود بخود)

کوئی[1] نہیں اے دل کہ اس کوچے میں پہنچا دے کبھی
کوئی اگر پہنچا بھی دے تو غیر اٹھوا دے مجھے

اے دل ! طریق عشق میں کوئی نہیں ہے راہ بر
جاؤں کہاں ، ڈھونڈوں کدھر ، رستہ تو بتلا دے مجھے

(آسمان کی طرف دیکھ کے)

اے آسماں ! دیتا ہے کیوں میری گرفتاری کو طول
زلفِ دراز یار میں ، اے کاش ! الجھا دے مجھے

کچھ اس سے حالِ دل کہوں تسکیں ہو دردِ ہجر کو
ہاں اے تصور ! یار کی تصویر دکھلا دے مجھے

(نوفل سلطانِ روم کا مع بعض اراکین دولت کے وارد ہونا)

نوفل

آؤ یہاں دیکھو ادھر ہے کون یہ خستہ جگر
ہے قومِ جن سے یہ کوئی یا ہم سا ہے یہ بھی بشر

۱- صنف کلام : غزل بحر رجز وافی سالم - وزن : مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن ، دوبار قصد شاعر : براعت استہلال واقعہ آیندہ ، مجنوں پر حالت مجذوبیت کا دوران ہے - ایسی حالت میں (بنا بر مذہب اہل اشراک) قوت غائب بینی اور پیشین گوئی کا ظہور ہوتا ہے - ایسے امور کا تجربہ ہوا ہے اور اکثر ہوا ہے - جو لوگ ان امور کے قائل نہیں ہیں (مثلاً اہل مادہ) اس کو اتفاق کے حوالے کرتے ہیں ، لیکن جو امر بار بار واقع ہوا ہو ، ہم حیران ہیں کہ اس کو ہم (بنا بر استقراء) کسی قانون فطری کی طرف کیوں نہ منسوب کریں (دیکھو کتاب ''انٹلکچول پاورس'' کرومبی)

وزیر

واقف ہوں میں اس سے شہا ! ہے یہ تو قیس عامری
لیلیٰ امیر نجد کی لڑکی پہ عاشق ہے یہی
دنیا و ما فیہا کی کچھ ، شاہا ! نہیں اس کو خبر
تصویرِ یار آٹھوں پہر رکھتا ہے یہ پیش نظر

نوفل

کیا یہ وہی دیوانہ ہے کہتے ہیں سب مجنوں جسے ؟
مدت سے تھی یہ آرزو میں بھی کہیں دیکھوں آسے
اس سے چلو باتیں کریں پوچھیں تو حالِ دردِ غم
دل ہر فراق یار میں ، کیا کیا گزرتے ہیں الم

وزیر

باتیں کسی سے یہ کبھی کرتا نہیں بےہوش ہے
ہے وِردِ لب ذکرِ صنم الفت کا دل میں جوش ہے

نوفل (وزیر سے مخاطب ہو کر)

مجھ کو بھی حسن و عشق کے لاکھوں فسانے یاد ہیں
خوش ہو کے یہ باتیں کرے ، ایسے بہانے یاد ہیں

(مجنوں سے مخاطب ہو کر)

اے[1] عاشق تفتہ جگر ! لیلیٰ کا ہوں میں نامہ بر
یہ مہر یہ ، سرنامہ ہے ، آنکھیں تو کھول اے بے خبر !
لایا ہوں تیرے دردِ دل کی میں دوا ہشیار ہو
لیلیٰ کا پیغامِ زبانی سن ذرا ہشیار ہو

۱- صنف کلام : ابیات (خطابی یا مرقع) بحر و وزن مثل غزل گزشتہ - قصد شاعر: نوفل پر حالت رحم طاری ہوئی- وزیر کو خوشامد کسی نہ کسی پیرائے سے منظور ہے - مجنوں کی آشفتہ سری ، بیتابی شوق ہر صورت سے ظاہر کی گئی ہے-

مجنوں

(التجا اور اضطرار کے لہجے میں)

اے قاصدِ لیلیٰ ترے قدموں پہ ہو مجنوں نثار
ہے گوش مشتاقِ سخن ہاں جلد کہہ پیغامِ یار
اے نامہ بر ، اے نامہ بر ! نامہ دے اس دل دار کا
ہاں جلد کہہ ہاں جلد کہہ پیغام کیا ہے یار کا

وزیر

نوفل ہے یہ سلطان روم اے بے خبر اے بے ادب !
ہر بار کہتا ہے اسے تو ''نامہ بر'' اے بے ادب !

مجنوں

لیلیٰ کے قاصد سے تو کچھ بڑھ کر نہیں سلطانِ روم
لیلیٰ کے کوچے سے تو کچھ خوش تر نہیں سامانِ روم
تم کہتے ہو جس کو ادب وہ رسمِ الفت میں نہیں
شاہ و گدا میں فرق کچھ عاشق کی ملّت میں نہیں
جز آستانِ یار ہم کو سر جھکانا منع ہے
تسلیم اور آداب کیا یاں ہاتھ اٹھانا منع ہے
ناساز[1] جب تقدیر ہو ساماں سے پھر ہوتا ہے کیا ؟
کار جب تدبیر ہو سلطاں سے پھر ہوتا ہے کیا ؟
جب یار قابو میں نہ ہو ثروت ہوئی تو کیا ہوا !
دل دار پہلو میں نہ ہو دولت ہوئی تو کیا ہوا !

۱- مجنوں کی گفتگو اگرچہ آزادانہ ہے لیکن حسن طلب بھی اس سے پایا جاتا ہے۔

وزیر (دھمکا کے)

باتیں نہ کر اس طرح کی ناحق تو مارا جائے گا
تیغِ عتابِ شاہ سے ----

(سر کی طرف اشارہ تلوار سے کرکے)

یہ سر آتارا جائے گا

مجنوں

کیا خوف ہم کو جان کا خود جان سے مرتے ہیں ہم
ھے موت اپنی زندگی ، کب موت سے ڈرتے ھیں ہم
میری بلا کو کیا خبر شاہ و گدا کیا چیز ھے
جز نامۂ لیلٰی یہاں جو چیز ھے ناچیز ھے

نوفل (وزیر پر خفا ھو کے)

کیوں چھیڑتے ھو تم اسے ھے رحم کے قابل یہ شخص
تیغِ جفائے ناز سے ھے آپ ھی بسمل یہ شخص

(مجنوں سے مخاطب ھو کر)

اے عاشق جاں باختہ ! چل ساتھ میرے نجد کو
کوشش سے میری کیا عجب ممکن وصال یار ھو
موجود ھوں میں ھر طرح تیری حمایت کے لیے
پہلو تہی ھرگز نہ ھوگی ، تیری وصلت کے لیے

مجنوں (کھڑے ھو کر)

شاھا ابھی چلتا ھوں میں گو ناتوان و زار ھوں
تا کوچۂ لیلٰی ابھی چلنے کو میں تیار ھوں
یہ شرط ھاں لیتا ھوں میں پھرنا نہ اپنے قول سے
کچھ مال و زر کے پاس سے جنگ و جدل کے ھول سے

وزیر

اے قیس ! دیوانہ ہے تو بے جا ہے یہ تیرا خیال
شاہوں سے نقص عہد ہو یہ امر ہے بالکل محال
تو نے کبھی شاہنشہوں کے بانک پن دیکھے نہیں
ہم نے تو اپنی آنکھ سے پیماں شکن دیکھے نہیں
چل اٹھ ہمارے ساتھ چل وہ بارگاہِ شاہ ہے
کیا فضلِ حق سے ہے کمی ہر چیز یاں ہم راہ ہے
چل اٹھ بساطِ خاک سے ، حمّام جا ، پوشاک لے
لیلیٰ بھی لے ، جاگیر بھی ، اسباب لے ، املاک لے

مجنوں

چلتا ہوں میں لے جانے پر تم کو اگر اصرار ہے
ہے یہ تو عین آرزو مجنوں ابھی تیار ہے

ساتواں سین—خیمۂ سلطانی

نوفل (ساقی سے مخاطب ہوکر)

لا[1] ساقیا شراب کہ فصل بہار ہے
بنت عنب کے ہجر میں دل بےقرار ہے
وہ جام دے کہ جس میں ہو ضو آفتاب کی
وہ جام دے کہ جس میں مہک ہو گلاب کی
وہ جام دے کہ دشت میں مہکے چمن کی بو
وہ جام دے کہ نجد میں پھیلے دلھن کی بو

۱- صنف کلام : ابیات (خطابی) بحر مضارع واق اخرب مکفوف محذوف یا مقصور - وزن : مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن دوبار اور جہاں مقصور ہے وہاں رکن آخر فاعلان ہے - قصد شاعر : براعت استقلال -

(قیس کی طرف اشارہ کرکے)

ہاں قیس کو بھی جام پلانا ضرور ہے
مشرب میں اپنے اس کو ملانا ضرور

(قیس امیرانہ لباس پہنے ہوئے ہے)

ساقی (قیس کو جام دیتا ہے)

پی آج دست شوق سے ساغر بھرا ہوا
کیا کل کی فکر کل بھی ہے کوثر بھرا ہوا

(قیس کا جام نہ لینا)

قیس (دل میں)

کیا ھجر میں شراب پیوں ھائے قہر ہے
آبِ حیات ہو تو مرے حق میں زہر ہے
کُھلتا نہیں کہ خواہشِ تقدیر کیا ہے اب
ایفائے عہدِ شاہ میں تاخیر کیا ہے اب

(نوفل سے مخاطب ھوکر)

شغلِ شراب سے مجھے فرمائیے معاف
شاھا وہ جام دیجیے جو دُرد سے ہو صاف
عیشِ مدام ہو جو میسّر تو لطف ہے
پہلو میں اپنے ہو جو وہ دلبر تو لطف ہے
زاھد کے واسطے تو یہ دنیا میں ہے حرام
اھل ریا کے واسطے عقبیٰ میں ہے حرام
رندوں کو ہے حلال اگر زر نصیب ہو
عاشق کو ہے حلال جو وصلِ حبیب ہو
جب وہ نہ پاس ہو تو مزا کیا شراب میں
دل ھی اداس ہو تو مزا کیا شراب میں

نوفل (قیس سے مخاطب ہو کر)

اے قیس! خوب یاد دلایا ابھی ابھی
تجھ کو ترے صنم سے ملایا ابھی ابھی
کہہ دو کہ سوئے نجد کوئی چوب دار جائے
عبدالعزیز کو درِ دولت پہ لے کے آئے

چوب دار (عبدالعزیز کو حاضر کرکے)

عبد العزیز حاضرِ دربار ہے شہا!

عبدالعزیز (بعد آداب و قدم بوسی، دست بستہ)

جو حکم ہو حضور کا لاؤں اسے بجا

نوفل

(عبدالعزیز کی طرف مخاطب ہو کے اور مجنوں کی طرف اشارہ کرکے)

عبدالعزیز! کون ہے تیرا یہ نوجواں؟

عبدالعزیز

فرزند میرے بھائی کا ہے، اے شہِ زماں!

نوفل

بیٹی ہے تیری کوئی کہ لیلیٰ ہے جس کا نام؟

عبدالعزیز

بیٹی کا میری نام ہے یہ، اے فلک مقام!

نوفل

ہو عقد آج دونوں کا منظور ہے مجھے
تجویز میں ہمارے کوئی عذر ہے تجھے؟

عبدالعزیز

کیا عذر مجھ کو حکمِ شہِ نام دار میں
لیکن نہیں یہ امر مرے اختیار میں
راضی ہو میری قوم تو حاضر ہوں میں شہا !
راضی نہ ہو جو قوم تو قاصر ہوں میں شہا !
نسبت کا یہ معاملہ ہے اے جہاں پناہ !
عزت کا یہ معاملہ ہے اے جہاں پناہ !
شاہا ! برے ہیں قیس کے اطوار کیا کروں
ہے قوم اس کے نام سے بے زار کیا کروں
کچھ شاہ و شہر یار کو اس میں نہیں ہے دخل
کچھ جبر و اختیار کو اس میں نہیں ہے دخل
جز حکمِ کردگار و شہنشاہِ انبیا
قومِ عرب پہ زور کسی کا نہیں چلا

نوفل

در پردہ کیوں ڈراتا ہے مجھ کو امیر نجد !
کچھ خوف جان کا نہیں تجھ کو امیر نجد !

عبدالعزیز

جو امر حق ہے کہتا ہوں وہ صاف صاف میں
دربار شاہ میں نہ کہوں گا خلاف میں
کیا خوف جان کا جسے عزت کا پاس ہو
کنبے کی شرم ہو جسے حرمت کا پاس ہو
میدان میں کسی سے نہ ہرگز دبا عرب
ڈرتا نہیں کسی سے خدا کے سوا عرب

حق کی طرف سے لڑنے کو حاضر ہے ساری قوم
دبتی نہیں کسی سے جہاں میں ہماری قوم
دیکھا ہے جب سے بانک پن اہل جہاد کا
سیکھا ہے قوم نے چلن اہل جہاد کا

نوفل (عبدالعزیز سے)

جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تو مانتا نہیں
نوفل ہے اپنے نام کا تو جانتا نہیں
جا کہہ دے اپنی قوم سے ہو مستعد جنگ

(سپہ سالار سے)

کل فوج سوئے نجد بڑھے یاں سے بے درنگ
مہلت ہے ایک رات کی پیراستہ ہو فوج
کل معرکہ ہے نجد میں آراستہ ہو فوج

آٹھواں سین ـــــ دیوانِ خاص

وزیر

حکم[1] بادشہ سے مجھے سخت انتشار ہوا
آج امیر نجد سے کیوں عزم کار زار ہوا
حکم بے درنگ دیا مجھ کو بھی طلب نہ کیا
میرے مشورے کا بھی شاہا نہ انتظار ہوا

نوفل

اے وزیر تجھ کو مگر کچھ نہیں ہے اس کی خبر
آج امیر نجد سے جو امر رو بہ کار ہوا

۱- صنف کلام قطعہ (مرقع) - اس کو غزل نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ غزل وہی ہے جس میں مضامین عشق و تمنا و حسرت و ہجر وغیرہ شامل ہوں - بحر مقتضب وافی مطوی - وزن : فاعلات مفتعلن فاعلات مفتعلن دوبار -

عقد قیس کو جو کہا ، اس نے کیا جواب دیا
اُس طرح کلام کیا مجھ کو نا گوار ہوا

وزیر

ننگ و نام پر تو شہا جان دیتے ہیں یہ عرب
ان معاملوں میں بھلا کس کا اختیار ہوا

اُس نے راست راست کہا کیا عتاب کی ہے یہ جا
کیا قصور اُس نے کیا کیوں گناہ گار ہوا

جو حضور کی ہو رضا اُس میں کیا ہے دخل مرا
گو خلاف رائے مری حکم شہر یار ہوا

(زانو پہ ہاتھ مار کے)

قیس کی خوشی کے لیے جس کو ہے جنوں کا خلل
خون بے گناہ سے کل دشت لالہ زار ہوا

نوفل

اے وزیر سچ تو کہا ، کیوں عبث یہ حکم دیا
کیا کرے گا پیش خدا مفت شرمسار ہوا

خیر جو ہوا سو ہوا ، سر سے ٹال دے یہ بلا
تیرے اس بیان سے مجھے سخت اضطرار ہوا

قیس کا خیال بھی ہے ، مجھ کو انفعال بھی ہے
عہد استوار ہوا ، سب پہ آشکار ہوا

جب سنیں گے اہل وطن سب کہیں گے عہد شکن
کیا سمجھ کہ میں نے کیا ، کیا مآل کار ہوا

نواں سین ــــ خیمۂ سلطانی

نوفل

خوش[1] نظری قیس کی ، آج کروں امتحان
کیسی ہے وہ خوش ادا ، جس پہ یہ دیتا ہے جان

جس کا یہ دیوانہ ہے ، کیسی ہے وہ سیم بر
یا کہ وہ کچھ بھی نہیں ، ہے یہ جنوں کا اثر

حسن خدا داد پر ، میں بھی ہوں دل سے نثار
قیس ہے جس پر فدا ، کیسی ہے وہ گل عذار

بھیس بدل کر ابھی ، نجد کو جاؤں ذرا
قیس کی معشوقہ کو ، دیکھ تو آؤں ذرا

۱- صنف کلام : ابیات بحر منسرح وافی مطوی مکسوف یا موقوف ۔ وزن: مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن دوبار اور جہاں موقوف ہے وہاں بجائے فاعان کے فاعلان ہے ۔ قصد شاعر : وضع سلاطین زمانۂ سلف ۔ نوفل کو اپنے نقص عہد کرنے کا بڑا خیال ہے ، جیسا کہ پچھلی نمایش میں ظاہر کیا گیا ۔ اب وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ لیلیٰ ایسی ہی حسین ہے جیسا کہ مجنوں کے عشق سے ظاہر ہوتا ہے ؟ اگر ایسا ہے تو کوئی صورت اس کے حاصل کرنے کی تجویز کی جائے ، اور اگر اس کے مثل یا اس سے بہتر حسین بھی دنیا میں یا میرے قبضے میں موجود ہیں تو مجنوں کو دیے جائیں اور ظن غالب ہے کہ مجنوں راضی ہو جائے ۔ نوفل کو کیا معلوم کہ مجنوں کا عشق لیلیٰ کے ساتھ مخصوص ہے ۔ نوفل مجنوں کو مثل اپنے ایک حسن پرست آدمی تصور کرتا ہے لیکن نوفل اور مجنوں کی حسن پرستی میں بڑا فرق ہے ۔ مجنوں کا عشق ایک خاص حسن کے ساتھ ہے اور نوفل عام حسن کو دوست رکھتا ہے ۔ مجنوں کا عشق بہ طور ''مونومانیا'' کے ہے ، خدا اس مرض سے بچائے ۔

دسواں سین ـــــ کوچۂ و بازار

(محل سرائے عبدالعزیز کے سامنے)

اعرابی

(صدائے فقیر)

رحم[1] کرو اے نجد کے لوگو
اس کا بڑا پھل پاؤ گے بابا

آج جو دو گے راہ خدا میں
حشر کے دن کل پاؤ گے بابا

(درِ عبدالعزیز پر سوال)

در پہ تمھارے آیا ہے بابا
اک اعرابی مرد مسافر

کل سے نہیں کچھ کھایا ہے بابا
دیر سے ہے دروازے پہ حاضر

آواز مادرِ لیلٰی (اندر سے)

شاہ سے ہے در پیش لڑائی
بھیک دے اس کو لیلٰی پیاری

کہنا دعا دے اے پردیسی!
جنگ میں ہو کل فتح ہماری

لیلٰی (باہر دوازے پر)

۱- صنف کلام : قطعات بحر متقارب وافی اثرم ، اخرم مقصور و مقبوض
وزن : فعلن فعلن فعلن فعلن قصد شاعر : اظہار عزم اہل نجد بنا بر جنگ
جو نوفل سے در پیش ہے ، لیلیٰ کا خیال نسبت اس جنگ کے -

آ تو کدھر ہے اے پردیسی!
بھیک لے مجھ سے اور یہ دعا دے
”نکلے یا رب حسرت دل کی
سب کے بچھڑے خدا ملا دے!“

”آہ کہاں تک نالہ و زاری
دور ہو یا رب درد جدائی!“
”جلد کہیں ہو فتح ہماری
بخت سے ہے در پیش لڑائی“

”دشمن جاں ہے ساری خدائی
مجھ سے فلک نے کی ہے برائی“
”اب نہیں اٹھتا بار جدائی
آگے آئے میرے بھلائی“

اعرابی (لیلیٰ سے بھیک لے کے)

مولا سے تو مراد پائے
تیرے بچھڑے خدا ملائے
خون کی ندی کون بہائے
ایسی لگی کون بجھائے

(دل میں)

قوم کا تیرے خون بہاؤں
یار سے تیرے تجھ کو ملاؤں
بار گنہ گردن پہ اٹھاؤں
جس کی سزا اللہ سے پاؤں

گیارھواں سین ۔ دربار خاص نوفل

نوفل (مجنوں سے سے مخاطب ھو کر)

قیس[1] ترے حال پہ آتا ھے رحم
آہ نہیں کچھ بھی تجھے عقل و فہم

تو نے سنا اپنے چچا کا کلام
دشمن جاں ھے وہ ترا لا کلام

پاس قرابت اسے بالکل نہیں
تیری محبت اسے بالکل نہیں

مستعد جنگ ھے وہ بے شعور
عقل میں ھے اس کی بلا شک فتور

سر بہ بلا کو وہ بلاتا ھے آپ
اپنی قضا کو وہ بلاتا ھے آپ

ھم نے یہ مانا وہ سلح شور ھے
قوم کا بھی اس کو بڑا زور ھے

۱- صنف کلام : مثنوی (خطابی یا مرقع) بحر سریع وافی مطوی موقوف یا مکسوف ۔ وزن : مفتعلن مفتعلن فاعلان دوبار اور جہاں مکسوف ھے وھاں رکن آخر فاعلن ھے ۔ قصد شاعر : نوفل کی طرف سے اظہار شان و شوکت فہایش کے پیرائے میں ، مجنوں کی ھمدردی ، مجنوں کی طرف سے جواب دیوانگی عشق کے ساتھ ۔ نوفل جرم عہد شکنی کی حمایت میں خدا ترسی کو پیش کرتا ھے ۔ اپنی کنیزوں کو لیلیٰ سے بہتر سمجھ کر مجنوں کو دکھاتا ھے مگر نوفل نے مجنوں کے مرض کی تشخیص میں غلطی کی ۔ یہ امر مجنوں کے لیے طبأ مضر ھے ۔ پس ضرور تھا کہ مجنوں کو ''مونومانیا'' کا دورہ شروع ھو جائے ۔ بہر صورت نوفل سے کوئی اخلاقی غلطی ظہور میں نہیں آئی ، وہ صرف خطائے طبی کا ملزم قرار دیا جا سکتا ھے ۔

شاہ رعایا کی بھلا جنگ کیا
دیکھ تو ہے اس کو یہ آھنگ کیا

ہم سے لڑائی کا ہے اس کو خیال
میں نے تو چاہا تھا کروں پائمال

روک نہ لے مجھ کو وزیر آج اگر
فوج ظفر موج بڑھی تھی ادھر

تیغ شرر بار ہے بے زینہار
نجد میں بچتا نہ کوئی نام دار

خون رعیت کا خیال آ گیا
روز قیامت کا خیال آ گیا

چاھتا ہے دشمن جانی کو تو
روگ لگاتا ہے جوانی کو تو

ایسوں کی اُلفت کو تو اب دل سے چھوڑ
ایسے عزیزوں سے تو رشتہ نہ جوڑ

چھوڑ دے لیلٰی کا نہ لے نام اب
اس کی محبت سے نہ رکھ کام اب

میں تو سمجھتا تھا کہ ہے کچھ حسیں
آنکھ سے دیکھ آیا ، وہ کچھ بھی نہیں

بھیس بدل کر میں گیا رات کو
دیکھ لیا بس تری اوقات کو

حسن کی کچھ شان نہ کچھ آن بان
بس اسی صورت پہ تو دیتا ہے جان ؟

حور شمائل تری لیلٰی نہیں
پیار کے قابل تری لیلٰی نہیں

گو وہ حسیں ہو مگر ایسی نہیں
میری کنیزوں سے بھی اچھی نہیں

(کنیز ہائے نوفل آتی ہیں)

(کنیزوں کی طرف اشارہ کرکے)

دیکھ تو کیسی ہیں یہ جادو نظر
تو جنھیں دیکھا ہی کرے عمر بھر

دیکھ تو ہیں ماہ جبیں یا نہیں ؟
پیار کے قابل یہ حسیں کیا نہیں ؟

کیسی یہ دلبر ہیں ذرا دیکھ تو
اس سے تو بہتر ہیں ذرا دیکھ تو

گوکہ یہ پیاری ہیں مجھے سب کی سب
آج سے دیتا ہوں تجھے سب کی سب

مال بھی لے خلعت و پوشاک بھی
منصب و جاگیر بھی املاک بھی

خدمت شاہی سے سرافراز ہو
روم کے سرداروں میں ممتاز ہو

مجنوں (دل میں)

آہ فلک کیا یہ سناتا ہے تو
پھر مجھے دیوانہ بناتا ہے تو

(نوفل سے)

عقل کدھر ہے تری اے بادشاہ!
شرط یہی تھی مری اے بادشاہ! ؟

عہد تیرا کیسا ہے نا پائدار
تیرے سخن کا نہیں کچھ اعتبار

هیچ ہے تو، پوچ ہے تیرا سخن
دیکھ لیا تجھ کو بھی پیماں شکن

مجھ کو خبر کیا کہ ہے کیا روم و شام
دل میں ہے یاں یاد صنم صبح و شام

دشت سے مسکن کوئی بہتر نہیں
خاک سے خوش تر کوئی بستر نہیں

قاقم و سنجاب سے کیا کام ہے
اطلس و کم خواب سے کیا کام ہے

(کپڑے اتار کے اور نوفل کے آگے پھینک کے)

ہے یہ تیرا خلعت و پوشاک خاک
لا وہ میرا پیرہنِ چاک چاک

خلعت و پوشاک کی پروا نہیں
منصب و املاک کی پروا نہیں

قدر ہو لیلیٰ کی تجھے کیا بھلا ؟
میرا سا دل میری سی آنکھیں تو لا

تیری کنیزوں میں کہاں وہ پھبن
نام خدا فرد ہے وہ گل بدن

عشق کی کیا تجھ کو خبر بے تمیز
حسن کو کیا جانے کہ ہے کون چیز

چاہوں میں جس کو وہی محبوب ہے
جس پہ دل آ جائے وو ہی خوب ہے

تیرے حسیں تجھ کو مبارک رہیں
درد و الم مجھ کو مبارک رہیں

دل کو مرنے ساز ہے اس غم کے ساتھ
الفت لیلٰی ہے میرے دم کے ساتھ

(قیس کا دیوانہ وار دشت کو چلے جانا)

بارھواں سین —— صحرا

(عالم یاس میں نالہ و زاری و بے قراری)

مجنوں (حالتِ اضطراب میں)

اے[1] فلک غم کی انتہا بھی ہے ؟
درد دل کی کوئی دوا بھی ہے

تا بہ کے ظلم اے خدا نا ترس ؟
دیکھ اے مدعی ! خدا بھی ہے

قتل کرتا ہے بے گنہ مجھ کو
آہ کچھ میرا خوں بہا بھی ہے

اے فلک ! ہم بھی جان رکھتے ہیں
دل بھی ہے دل میں مدّعا بھی ہے

وصل جاناں اگر ہے نا ممکن
میری تقدیر میں قضا بھی ہے

۱- صنف کلام : غزل مسلسل ، بحر خفیف وافی مخبون مسکن محذوف یا مقصور- وزن : فاعلاتن مفاعلن فعلن دو بار اور جہاں قصر ہے وہاں رکن آخر فعلان ہے - قصد شاعر : اظہار حالت یاس و اضطرار درجۂ انتہا -

قیس کے نزدیک اس کے سب دشمن ہیں ، یہاں تک کہ اس کے افعال و اعمال - کسی نہ کسی پیرائے میں نوفل کی نصیحت کا خیال بھی اس کے ذہن میں منعکس ہو رہا ہے ، جیسا کہ اس مصرع سے ظاہر ہے - ع

"دشمن جاں وہ بے وفا بھی ہے"

کیا کہوں تم کو نالہائے دراز
مدعی بختِ نا رسا بھی ہے

ناوکِ آہ کیوں خطا کرتا
اس میں تقدیر کی خطا بھی ہے

جذبِ دل کا فقط نہیں ہے گلا
کیا کروں بے اثر دعا بھی ہے

کیا کہوں تجھ کو شوق شور انگیز
آہ صبر گریز پا بھی ہے

دل شوریدہ کم نہ تھا لیکن
اک بلا جان مبتلا بھی ہے

چرخ کا کیا گلا کرے کوئی
دشمنِ جاں وہ بے وفا بھی ہے

کس سے پوچھوں کدھر ہے کوچۂ یار
بے خودی کوئی رہنما بھی ہے؟

مجنوں

دورِ[۱] گردوں ہے مجھے در در پھرانے کے لیے
میرے باعث سے ہوئی گردش زمانے کے لیے

بے نوائی ہو مقدر میں تو کیجے عاشقی
یہ بہانہ خوب ہے ذلت اٹھانے کے لیے

۱- صنف کلام : غزل ، حسب حال - بحر رمل وافی محذوف - وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دوبار ، قصد شاعر : مجنوں پر وہ شدت جنوں کی طاری نہیں ہے جیسا کہ پچھلی دو نمایشوں میں ظاہر کیا گیا ہے - اب اس کو کسی قدر افاقہ ہے - اس صورت میں اگلے پچھلے حالات کا انعکاس ہو رہا ہے -

جز الم حاصل نہ ہوگا میرے خرمن سے مجھے
منتظر ہے آسماں بجلی گرانے کے لیے

شام غم کی آفتیں اے دل! میں تجھ سے کیا کہوں
کون کس کس بھیس میں آیا ڈرانے کے لیے

اس نزاکت کا برا ہو کچھ نہ نکلا کام دل
تو ہی اے شوخی! اُبھار اس کو ستانے کے لیے

واں تغافل ہے سراسر، خوش ہوں یاں میں سادہ دل
اک ادا ہے یہ بھی الفت آزمانے کے لیے

اپنے صورت‌گر سے پوچھوں میں اگر مقدور ہو
کیا بنایا تھا مجھے تو نے مٹانے کے لیے؟

ھجر کی شب کے بنانے میں بھی تھی اک مصلحت
طول آخر چاھیے تھا کچھ زمانے کے لیے

زندگی میں ہے ہمیں دوزخ کہ دل رکھتے ہیں ہم
کم ہے یہ آتش کا پرکالہ جلانے کے لیے

موت کے آنے سے ہم فرقت زدہ یوں خوش ہوئے
جیسے اُن کا آدمی آیا بلانے کے لیے

منزل مقصود تک 'مرزا' پہنچ ہی جائیں گے
خضرِ دل ہم راہ ہے رستہ بتانے کے لیے

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ چہارم

پہلا سین ـــــ ساقی نامہ

(بہت سے لوگ مل کے گاتے ہیں)
(کورس)

ساقیا[1] لا کہ بہار آئی ہے
لا پیالہ کہ بہار آئی ہے

ساقیا بادۂ گلفام پلا
دُرد سے صاف ہو، وہ جام پلا

قرض دے قرض کہاں دام رہے
فاقہ مستوں میں مرا نام رہے

ساقیا بادۂ انگوری دے
دُرد آ شام کی دستوری دے

مشورے ہیں ترے مے خواروں میں
آج شب بھر تو رہے یاروں میں

۱- صنف کلام : مثنوی بحر رمل مجزو و مخبون مسکن محذوف یا مقصور - وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلن ، دو بار - جہاں قصر ہے وہاں رکن آخر فعلان ہے - قصد شاعر : تشبیب ، براعت استہلال - سامعین کی طبیعت کو ان مضامین کی طرف سے جو پچھلی نمایشوں میں بیان کیے گئے ، اور طرف متوجہ کرنا - ایک ہی طرز کے بیان سے طبیعت اکتا جاتی ہے - شاعر اور خطیب کو ضرور ہے ، تجدید خیالات کا لحاظ رکھے -

بادۂ ناب کے جلوے دیکھیں
شب مہتاب کے جلوے دیکھیں

جمگھٹے خانۂ خمار میں ہوں
جب اٹھیں واں سے تو گلزار میں ہوں

سر دھنیں زہد و عبادت والے
جھومتے جائیں ترے متوالے

اور سامان طرب ہوتا ہے
آج مطرب بھی طلب ہوتا ہے

سازوساماں سے چلیں گلشن میں
توڑ کر پھول بھریں دامن میں

آج ہر بات میں رنگینی ہو
خوب گل بازی و گل چینی ہو

التجا تجھ سے یہ ہے اے ساقی!
ساتھ لے شیشۂ مے اے ساقی!

بہنگیوں پر تو ہوں دو چار سبو
کشتیوں میں ہوں کباب آہو

نرگسی ہوں وہ کباب اے ساقی!
ارغوانی ہو شراب اے ساقی!

خوب بدنام ہوں وہ بات کریں
آج واعظ کی مدارت کریں

کچھ سر انجام ظرافت ہو آج
زاہد خشک کی دعوت ہو آج

کوئی مسجد کی طرف سے جائے
واعظ شہر کو لیتا آئے

اور ہو جائے اگر بیر تو ہو
مگر اس وقت ذرا سیر تو ہو

سامنے اس کے پئیں خوب شراب
زاھدِ خشک ہو جل بھن کے کباب

واں جوانانِ چمن جھومتے ہوں
یاں ترے توبہ شکن جھومتے ہوں

کوئی 'مرزا' کو یہ دے جا کے پیام
جمع ھیں باغ میں سب مے آشام

لطف صحبت کا نہیں تیرے بغیر
تو نہ ہو جب تو ھے کیا باغ میں سیر

کون سنتا ھے بیانِ بلبل
بارِ خاطر ھے فغانِ بلبل

چھوڑ افسانۂ قیس و لیلا
قصۂ غم کو بہت طول ہوا

چٹکلا کوئی ظرافت کا سنا
حال طرّار کی الفت کا سنا

اس کو خیلا سے تھی کیسی الفت
کس طرح اس نے نباھی چاھت

کیا اس آغاز کا انجام ھوا
کس طرح شہر میں بدنام ھوا

دوسرا سین ـــــ دکان مے فروش

طرّار (دل میں)

آج[1] کلوار کو دے کے بھرّا
خوب جی بھر کے پیتے ہیں ٹھرّا

جس کی ہر بوند ہو جیسے چھرّا
جس کو پیتے ہی لگ جائے گھرّا

(مے فروش سے)

ساقیا ایک آدھا تو لادے
اور گزک کو کچالو منگا دے

آج پکّے گھڑے کی پلا دے
ایک چلّو میں آلو بنا دے

(مے فروش)

آؤ طرّار بانکے کہاں تھے؟
آج سب دام لینا ہیں تم سے

طرّار

ایک کوڑی نہیں یاں گرہ میں
مفلسی میں تمھیں دام کیا دیں

۱۔ صنف کلام : ابیات، بحر متدارک وافی اخذ، وزن : فاعلن فاعلن فع ، دو بار۔ قصد شاعر : اظہار وضع و احوال طرار ۔ طرار کی بول چال سے اس کا شہدا پن ظاہر ہے ۔ وہ شراب پیتا ہے اور مدت سے پیتا ہے اس لیے کہ کلوار کا مقروض ہے ۔ بہ ہر صورت اس گفتگو اور اس واقعے سے اس کے پچھلے حالات کا نشان بہ خوبی ملتا ہے ۔ (کلوار بمعنی مے فروش جو معمولی دیسی شراب ٹھرّا بیچتا ہے)

(مے فروش)

قرض دیں هم بهلا تم کو کب تک ؟
دام اگلے نہیں پائے اب تک

طرّار

ایک اَدّها مجهے اور دو تم
صبح کو اپنے سب دام لو تم

(مے فروش)

آج تو خیر تم اور پی لو
کل جہاں سے بنے دام لا دو

(اَدّها چڑها کے اور کچالو زهر مار کر کے)

طرّار (خود بخود)

یاں سے جاتا هوں خیلا کے گهر پر
اس کا فقرے سے لاتا هوں زیور

تیسرا سین ۔ مکان زهره طوائف

(کمرۂ خیلا نوچی)

خیلا (طرار کو دیکھتے هی)

اجی[۱] تم تو جهوٹوں کے سردار نکلے
دغا باز عیّار مکّار نکلے

۱۔ صنف کلام : غزل (یا قطعه) خطابی یا مرقعی ۔ اس کو غزل اس لیے کہه سکتے هیں که اس میں مضامین عشقیه بهی شامل هیں ۔ بحر متقارب وافی سالم ۔ وزن : فعولن فعولن فعولن فعولن ، دو بار ۔ قصد شاعر : خیلا اور زهره کی بے رخی ، طرار کی طرف سے اظهار محبت ظاهری، بیهوده دهمکی ، جعل و فریب ، راه گیروں کی زبان سے نصیحت ۔

طرّار

ترے واسطے گھر سے دل دار نکلے
غضب ہے اگر تو دل آزار نکلے

خیلا

سمجھتی تھی زر دار میں تم کو پہلے
مگر تم تو بالکل ہی نادار نکلے

طرّار (سمجھانے کے لہجے میں)

نکل چل مرے ساتھ تو لے کے زیور
تو کچھ آرزوئے دلِ زار نکلے

خیلا (دھمکانے کے لہجے میں)

سنیں گی جو بیوی تو ماریں گی جوتے
نہ یہ بات منہ سے خبردار نکلے

(زہرہ آتی ہے)

زہرہ (تعجب کے لہجے میں)

یہ رنڈی بھگانے کی کیا گفتگو تھی
بڑے آپ طرّار فرّار نکلے

طرّار (زہرہ سے)

جو یہ خود نکلنے کو کہتی ہو مجھ سے
تو پھر منہ سے کیوں حرف انکار نکلے

زہرہ (طرّار سے)

بلا شک تمھاری اگر ہو یہ راضی
ابھی میرے گھر سے یہ مردار نکلے

خیلا (نہایت تعجب سے)

ارے مردوے جھوٹ کیوں بولتا ہے
ترے ساتھ بندی کی پیراز نکلے

طرّار (خیلا سے، دھمکا کے)

ابھی ناک کاٹوں میں چاقو سے تیری
اگر تو کسی سے گرفتار نکلے

خیلا (طرار سے چلا کے)

نہ لینا نہ دینا اور اس پر حکومت
بڑے آپ بانکے طرح دار نکلے

زہرہ (طرّار سے)

نہ پیسہ نہ کوڑی اور اس پہ یہ دھمکی
بڑے آپ رنڈی کے مختار نکلے

(اپنے نوکروں سے)

کوئی ہے! اسے دے کے دھکے نکالو
مرے گھر سے فوراً یہ بدکار نکلے

طرّار (نہایت غصے میں)

لگائیں اگر ھاتھ مجھ کو یہ بھڑوے
ابھی میان سے میرے تلوار نکلے

زہرہ (کسی قدر سہم کے)

یہ دھمکی کسی اور کو دیجیے گا
مری جان کو آپ خوں خوار نکلے

طرّار (اور دھمکا کے)

مرے باپ کا نام لیتی ہے قحبہ
سخن پھر نہ منہ سے یہ زنہار نکلے

نوکر (طرار کو پکڑ کے)

ابھی جا کے دیتے ہیں اس کو پلس میں
اگر پاس سے اس کے ہتیار نکلے

(جوتے پڑتے جاتے ہیں)

نکل یاں سے موذی نکل یاں سے مردک

طرّار

ابے یار! نکلے، ابے یار! نکلے

سین (۳)——کوچۂ دروازۂ مکان زہرہ طوائف

طرّار (افسوس کے لہجے میں)

نہ نکلی وہ جانِ جہاں ساتھ اپنے
و لیکن ہمیں آخرِ کار نکلے

ایک راہ گیر

نکلتے نہ تم تو کبھی گھر سے اپنے
مگر کیا کرو جب پڑی مار نکلے

دوسرا راہ گیر

وہ رنڈی نہیں گھر میں بیٹھے کسی کے
جو سو بار بیٹھے تو سو بار نکلے

چوتھا سین ـــ سرِ بازار

(خیلا کے فراق میں بے قراری)

خیلا[1] سے ہے لڑائی، فریاد رس الٰہی
اب موت میری آئی، فریاد رس الٰہی
ہے ہے وہ مجھ سے چھوٹی، ہے ہے وہ مجھ سے روٹھی
ہے ہے ہوئی جدائی، فریاد رس الٰہی
اب چل کے جان دوں گا، ہرگز نہ میں جیوں گا
یہ دل میں ہے سمائی، فریاد رس الٰہی

لونڈی

خلاّق بے نظیری، دو روٹیاں خمیری
ڈبیا دیا سلائی، فریاد رس الٰہی

طرّار

تھا عشق پاک ہم سے، یہ تھا تپاک ہم سے
نے وصل نے جدائی، فریاد رس الٰہی
ہم نے تو کی بھلائی، دولت اسے کھلائی
کی اس نے بے وفائی، فریاد رس الٰہی
تقدیر نے چھڑایا، امداد کن خدایا
قسمت نے کی برائی، فریاد رس الٰہی

۱- صنف کلام : غزل بحر مضارع وانی اخرب سالم ـ وزن : مفعول فاع لاتن مفعول فاع لاتن، دو بار۔ قصد شاعر : اظہار اس امر کا کہ وہ نشۂ شراب (یا عشق) جو خدمت گاروں کے جوتوں سے بہ مشکل آترا ہے، اب پھر سر پر چڑھا ہے ـ اس حالت کو نشے کی حالت کے سوا اور کیا کہوں ـ اگر جنون عشق ہوتا تو پھر طمع زیور کی ہرگز نہ ہوتی، مگر ہاں، ہم اس کو ایک اور قسم کا جنون کہہ سکتے ہیں، یعنی اخلاق جنون ـ

ہے مفلسی قیامت ، ہے نائکہ کو نفرت
کیوں کر ہو اب رسائی ، فریاد رس الٰہی

لونڈی

اب زر نہیں کمر میں ، زر نیست عشق ٹیں ٹیں
دیتے پھرو دھائی ، فریاد رس الٰہی
تو یار اس سے حلوا ، چرکٹ پھنسا کے لے جا
ہو جائے گی صفائی ، فریاد رس الٰہی

طرّار

یارو کوئی ملا دے ، خیلا کو یاں بلا دے
اب لب پہ جاں آئی ، فریاد رس الٰہی

لونڈی

آتا ہے تیرا بابا ، تو اس سے کہہ کے ملوا
کر یہ بھی بے حیائی ، فریاد اس الٰہی

(خوں خوار خاں آتے ہیں)

طرّار (خوں خوار سے التجا کے لہجے میں)

مجھے[1] خیلا سے ملوا دے ابے باوا ابے باوا
نہیں تو ہاتھ دھو مجھ سے ابے باوا ابے باوا

۱- صنف کلام : غزل مرقع - خونخوار کے بیان میں ردیف بدل دی گئی ہے - بحرہزج وافی سالم - وزن : مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ، دو بار - قصد شاعر : طرار پر نشے کی حالت طاری ہے ، مگر بناوٹ بھی اس میں شامل ہے - خوں خوار پر تنفر اور طیش کی حالت طاری ہے - ناظرین سمجھیں گے کہ اس نمایش میں شاعر نے ضرور مبالغہ کیا ہے - کبھی باپ بیٹوں میں اس بد تہذیبی کے ساتھی گفتگو نہیں ہو سکتی ، مگر مصنف افسوس کے ساتھ یقین دلاتا ہے کہ اس نے بہ چشم خود ایسے واقعات بلکہ اس سے بدرجہا بدتر اپنے ہم وطن بعض نوجوانوں میں مشاہدہ کیے ہیں - فاعتبروا یا اولی الابصار -

نہ میں بیٹا ہوں پھر تیرا نہ تو باوا ہے پھر میرا
جو کی پہلو تہی تو نے ابے باوا ابے باوا

(کسی قدر غصے سے مگر تمسخر کے لہجے میں)

مروں میں عشق میں کب تک نہیں لیتا خبر اب تک
ابے بوبک ، ابے بڈھے ، ابے باوا ، ابے باوا !

خوں خوار خاں (بہت تعجب سے)

یہ کیا انداز ہیں تیرے ، ابے مردک ! ابے گرگے !
یہ کیسے سیکھے ہیں شیوے ابے مردک ! ابے گرگے !

"ابے باوا ، ابے باوا !" یہ کیا بکتا ہے تو مرغے
ابے یہ گفتگو ہم سے ؟ ابے مردک ، ابے گرگے !

ملاؤں تجھ کو خیلا سے یہ تو کہتا ہے باوا سے
تو ہم تیرے نہیں بھڑوے ، ابے مردک ، ابے گرگے !

طرّار (تمسخرِ نفرت انگیز کے ساتھ)

ارے وہ جان ہے میری ، ارے ایمان ہے میری
ادا پر اس کی میں صدقے ، ابے باوا ! ابے باوا !

جو اس وقتِ مصیبت میں نہ آیا کام تو اپنے
تو کیا امید ہے تجھ سے ، ابے باوا ! ابے باوا !

مرے نانا (خدا بخشے) اگر اس وقت میں ہوتے
ابھی خیلا سے ملواتے ، ابے باوا ! ابے باوا !

خوں خوار (نفرت سے)

خراب اس نے کیا تجھ کو وہ جائے گا جہنّم کو
پڑیں گے گور میں کیڑے ، ابے مردک ! ابے گرگے !

طرّار (فخر کے ساتھ)

ابے اُن کو خدا بخشے، دیا کرتے تھے جب پیسے
اُڑائے خوب کنکوّے[1] ، ابے باوا ! ابے باوا !

بڑھایا سات تاری پر تو اکثر تیلی کاٹی
دیے وہ ڈور پر مانجھے ابے باوا ! ابے باوا !

لڑا میدان جب راجا سے اور نواب دولھا سے
نکالے ہم نے بھی لگے ، ابے باوا ! ابے باوا !

ہوئے مشّاق ہم ایسے بٹیروں کے لڑانے میں
کریزوں سے لڑے بھگتّے ، ابے باوا ! ابے باوا !

کبوتر کی ہوا آئی تو لے کر ہاتھ میں چھیپی
اُڑائے خوب ہی پٹھے ، ابے باوا ! ابے باوا !

ہوُا جب راگ کا لہرا ملے ہم تان رس خاں سے
بڑھائے خوب یارانے، ابے باوا ! ابے باوا !

بہت کیں منتیں اُن کی ، بہت کیں خدمتیں اُن کی
لیے پھرتے تھے طنبورے ، ابے باوا ! ابے باوا !

یہی تھے رات دن چرچے، یہی تھے رات دن جلسے
بجائے خوب ہی طبلے ، ابے باوا ! ابے باوا !

ہوا یاروں میں جب رہنا ، چرایا ماں کا سب گہنا
اُڑائے خوب گل چھرّے ، ابے باوا ! ابے باوا !

خوں خوار (نہایت طیش میں دانت پیس کے)

گھرانے کی مٹائی آبرو کم بخت کیوں تو نے
ابے تجھ سے خدا سمجھے ! ابے مردک ابے گرگے !

۱۔ کنکوے اور پتنگ اُڑانے کی موٹی ڈوریں ۔

آڑاتا ہے کبوتر تو ، لڑاتا ہے بٹیریں تو
ابے او آلو کے پٹھے ! ابے مردک ابے گرگے !

سناتا ہے ہمیں کیوں تو ، ہمیں کیا کام ہے اس سے
ابے او مرغی کے بچے ! ابے مردک ابے گرگے !

طرّار (اطمینان کے ساتھ)

ہم[1] اب تو ہو گئے شہدے ، اٹھایا کرتے ہیں مردے
ہر اک گُن میں ہیں ہم پورے ، ابے باوا ! ابے باوا !

(ذرا چپکے سے خوب چلا کے)

کوئی پھنس جاتا ہے چرکٹ تو ملواتے ہیں ہم دوسر
کہ مل جاتے ہیں چار آنے ، ابے باوا ! ابے باوا !

ٹکے جب ہاتھ آتے ہیں ، چرس کے دم لگاتے ہیں
چلم سے اٹھتے ہیں شعلے ، ابے باوا ! ابے باوا !

پیا کرتے ہیں دم سلفا ، ہمیشہ دے کے اک گنڈا
آڑایا کرتے ہیں بقّے ، ابے باوا ! ابے باوا !

خون خوار (فخر کے ساتھ)

نہیں یاں شوق نشے سے ، سوا افیون چنڈو کے
چرس پیتا ہے تو بقّے ، ابے مردک ! ابے گرگے !

(بہت تعجب سے ، نفرت سے)

ابے کیا کالا پانی پی کے آیا ہے تو بھٹی سے
یہ کیسے آتے ہیں بھبکے ، ابے مردک ! ابے گرگے !

۱- تصحیح قیاسی-

طرّار (فخر کے ساتھ)

شراب شوق پیتے ھیں، ھمیشہ مست رھتے ھیں
(ایک بقّہ[1] باپ کی طرف چھوڑ کے)
یہ خوشبودار ھیں بقّے، ابے باوا! ابے باوا!

خون خوار

نہ تھے گستاخ ھم اپنے بزرگوں سے کبھی ایسے
چھپا کے پیتے تھے حقّے، ابے مردک! ابے گرگے!
(غصے سے تھر تھرا کے)
نہ آئے گا کبھی گھر پر، کہوں گا تیری امّاں سے
لگائے گی تجھے جوتے، ابے مردک! ابے گرگے!

طرّار (تمسخر اور اطمینان سے)

ابے ڈرتا نہیں ھم سے کہ اب ھم ھو گئے بانکے
ابے ھم ھو گئے شہدے، ابے باوا! ابے باوا!

خون خوار

وھی ھیں آج کل بانکے جو کھایا کرتے ھیں جوتے
پڑیں منڈے تو ھوں گنڈّے، ابے مردک! ابے گرگے!
(فخریہ)
کیے ھیں بانکپن ھم نے، کبھی ھم بھی تو تھے بانکے
یہ ھیں تلوار کے ٹانکے، ابے مردک! ابے گرگے!
لڑا کرتے تھے اکثر خانہ جنگی ھم جوانی میں
مگر اب ھو گئے بڈّھے، ابے مردک! ابے گرگے!

۱- بقہ بمعنی سانس کا بھبکا۔

طرّار (ذرا اکڑ کے)

تو ہم بھی لٹھ بہادر ہیں نہیں اس میں بھی کم تم سے
کہ ہیں کس باپ کے بیٹے ، ابے باوا ! ابے باوا !

خوں خوار (بہت نفرت سے)

ابے بیٹا ہے تو کس کا غلط ہے یہ ترا دعویٰ
ہمارا تُو ، نہ ہم تیرے ، ابے مردک ! ابے گرگے !

طرّار (ذرا تمسخر آمیز فخر کے ساتھ)

ابے باوا ہے تو کس کا ، کہا تھا تیری خاطر سے
ہم اپنی ماں کے ہیں بیٹے، ابے باوا ! ابے باوا !

(التجا کے ساتھ)

بہت ہیں آج کل مفلس ، خمیری روٹیاں لے دے
ابے ہم ہیں بہت بھوکے ، ابے باوا ! ابے باوا !
جو اب ہم سچ بھی کہتے ہیں ، کوئی باور نہیں کرتا
کہ ہم مشہور ہیں جھوٹے ، ابے باوا ! ابے باوا !
ہمیں کپڑے بنا دے تو ، ہمیں جوتا پنہا دے تو
ہمارے پھٹ گئے کپڑے ، ابے باوا ! ابے باوا !
اور اک بوتل ہمیں لا دے ، پئیں ہم آج جی بھر کے
نہیں تو دے ہمیں پیسے ، ابے باوا ! ابے باوا !

خوں خوار (کسی قدر دھیمے ہو کے)

بچا تم ہو گئے سنڈے ، لگائیں گے تمہیں ڈنڈے
نہ دیں گے ہم کبھی گنڈے ، ابے مردک ! ابے گرگے !

طرّار

نہ تھے تم ایسے مسٹنڈے ، جوانی میں بھی تھے ٹھنڈے
(نہایت فخر سے)

ہمارے گڑ گئے جھنڈے ، ابے باوا ! ابے باوا !

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ پنجم

پہلا سین ــــ ساقی نامہ

(پردے کے اندر گایا جاتا ہے)

بھولا[1] ہوں جسے یاد دلا دے مجھے ساقی
تھوڑی سی شراب اور پلا دے مجھے ساقی

ہو جام بلوریں میں رخِ صاف کا جلوہ
نیرنگ یہ آنکھوں سے دکھا دے مجھے ساقی

فرقت کے الم اب تو اٹھائے نہیں جاتے
ہاں شاھد اصلی سے ملا دے مجھے ساقی

ہے ہے مجھے یاد آتا ہے مجنوں کا تڑپنا
اب تربتِ لیلٰی کا پتا دے مجھے ساقی

یہ دور بھی آخر ہے اور انجام میں ہے موت
زھراب بھی تھوڑا سا پلا دے مجھے ساقی

دوسرا سین ــــ صحرا

(مجنوں ایک پیرزن اور جوان اسیر سے ملتا ہے)

مجنوں (خود بخود)

۱- صنف کلام - غزل مسلسل ، ساقی نامہ ، بحر ہزج وافی اخرب مکفوف محذوف یا مقصور - وزن : مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن - دو بار - جہاں قصر ہے وہاں بجائے فعولن کے فعولان ہے - قصد شاعر تمہید خاتمہ مرقع -

مستزاد

وادی[1] نجد میں لے چل مجھے اے شوق رسا
بن کے تو راہ نما
کہ جہاں کوچۂ دل دار کی آتی ہے ہوا
رات دن صبح و مسا

(پیرزن مع جوان اسیر کے آتی ہے)

(پیرزن سے مخاطب ہو کر)

پیر زن کیوں یہ جواں قابل تعزیر ہوا ؟
پا بہ زنجیر ہوا ؟
کیوں ترے ہاتھ سے اس طرح یہ تشہیر ہوا ؟
کیوں یہ دل گیر ہوا ؟
سچ بتا دے کوئی ہم درد ہمارا تو نہیں ؟
عشق لیلٰی تو نہیں ؟
یہ مری طرح کوئی عاشق رسوا تو نہیں ؟
غم کا مارا تو نہیں ؟

پیرزن

نہ یہ قیدی ہے کسی کا نہ گرفتار ہے یہ
دل کا مختار ہے یہ
ہاں فقط پیٹ کے دھندے کے لیے کار ہے یہ
اس میں اسرار ہے یہ

۱- صنف کلام : مستزاد ابیات بحر رمل وافی مخبون محذوف یا مسکن محذوف مستزاد - وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن - فاعلاتن فعلن - دوبار اور جہاں مسکن ہے وہاں فعلن بہ سکون عین لیا گیا ہے - قصد شاعر اظہار دیوانگی عشق مجنوں - انجام کار طرار بد اطوار اس نمایش کے بعد کہیں نہیں آئے گا -

صبح کو روز اسے زنجیر پنہاتی ہوں
نجد لے جاتی ہوں
ہر گلی کوچے میں تا شام پھراتی ہوں
بھیک منگواتی ہوں میں
میرا مقروض سمجھ کر جو ترس کھاتا ہے
کچھ اسے دیتا ہے
نصف میں لیتی ہوں اس میں سے جو یہ پاتا ہے
نصف یہ لیتا ہے

مجنوں

پیرزن چھوڑ دے اس شخص کو از بہر خدا
مجھ کو زنجیر پنہا
اس طرح سے تو مجھے نجد کے کوچوں میں پھرا
اپنا پابند بنا
جو ملے تجھ کو نہیں اس میں اجارا میرا
مجھ کو حصہ بھی نہ دے
مدت العمر نہ بھولوں گا میں احسان ترا
مول لے مفت مجھے
کیا عجب کوچۂ لیلیٰ میں کسی دن ہو گزر
گھر سے نکلے وہ ادھر
میں اسے دیکھوں مجھے دیکھ لے وہ ایک نظر
ہوں نظارے دم بھر

پیرزن (مجنوں سے)

اگر اس امر میں ہے آپ ہی اصرار تجھے
کیا ہے انکار مجھے

(اُس جوان سے)

کرکے بے کار رہا کرتی ہوں طرّار تجھے
نہیں درکار مجھے

طرّار

تجھ کو قسمت سے یہ دیوانہ ملا اے نانی
کیا کروں میں کم بخت
خلل آیا مری روزی میں ہوئی حیرانی
آہ سنگ آمد و سخت

(پیرزن طرّار کو رہا کرتی ھے، مجنوں کو طوق و زنجیر پہناتی ھے)

مجنوں

دل[1] سے میں شیفتۂ زلف گرہ گیر ہوا
پا بہ زنجیر ہوا
خود ھی تقصیر کی خود قابل تعزیر ہوا
خود ھی تشہیر ہوا
واہ کیا میرے مقدر نے مری یاری کی
کیا مددگاری کی
تیرا ممنون میں اے خوبیٔ تقدیر ہوا
رہن تدبیر ہوا
رشک آتا ھے مقدر پہ مرے خود مجھ کو
کہیں دھوکا تو نہ ہو
نالہ کس طرح سے منت کش تاثیر ہوا
کارگر تیر ہوا

۱۔ صنف کلام : غزل ، مسلسل بحر و وزن مثل سابق ۔ قصد شاعر : اظہار مسرت مجنوں بہ امید دیدار لیلیٰ ۔

ھتکڑی ھاتھوں میں ھے پاؤں میں بھاری زنجیر
ضعف ھے دامن گیر
طوق گردن میں پڑا شوق گلوگیر ھوا
غم کی تصویر ھوا
عشق نے آج پنھایا ھے یہ بھاری زیور
ھیں برھنہ تن و سر
آج عشاق میں میں قابل توقیر ھوا
خوب تشہیر ھوا

تیسرا سین —— کوچۂ لیلیٰ

مجنوں

مری[1] بے خودی ھوئی راہ پر کہ تری گلی میں ھوا گزر
سر بام آ کبھی بے خبر مجھے دیکھ تو بھی تو اک نظر

(لیلیٰ کا سربام نظر آنا)

مرے جذب دل نے کیا اثر، وہ پری ھے بام پہ جلوہ گر
جو نگہ کے تیر ھوں کار گر، تو بچیں نہ آج دل و جگر

دل بے قرار کو ھے خبر، کہ لڑی ھوئی تھی نگاہ ادھر
دل غم کشیدہ و چشم تر ھوئے دونوں دشمن ھم دگر

اسے یہ لگی ھے گلے لگائیں، اُسے یہ پڑی ھے کہ دیکھے جائیں
ھے ادھر یہ نعرہ کہ ھے غضب، ھے اُدھر اشارہ کہ حیف نظر

۱- صنف کلام: غزل مسلسل خطابی، بحر کامل وافی سالم - وزن: متفاعلن، متفاعلن متفاعلن متفاعلن دو بار، مقصد شاعر: مجنوں کی طرف سے اظہار مسرت و شوق لیلیٰ کی طرف سے اظہار وفا و مجبوری -

یہ ہے شوق دید کی التجا کہ ابھی تو جی ہی نہیں بھرا

(غش آتا ہے ، پیرزن اٹھاتی ہے)

مجھے دیکھ لینے دے اک ذرا جو ہو غش سے فرصت یک نظر
نہیں تاب دید مجھے ذرا تجھے دیکھوں میں یہ مجال کیا
یہ ہے رعب حسن کا ادّعا کہ نگاہ بھر کے نہ دیکھ ادھر

لیلیٰ (آواز سن کے)

یہ صدا ہے کس کی بتا دلا کہ ہیں کان اس کے کچھ آشنا
مرے قیس کی یہ نہ ہو صدا کہ دل و جگر میں گئی اتر

(مجنوں کو دیکھ کے)

یہ اسیرِ خستہ و ناتواں یہ اجل گرفتۂ نیم جاں
مرا جاں نثار ہے بے گماں دل بے قرار کو کیا خبر

(پیر زن سے مخاطب ہو کر)

یہ اسیر کس کا ہے پیرزن کہ ہے دست و پا میں بندھی رسن
تو خدا کو مان ذرا ٹھہر مجھے اس کے حال کی دے خبر
یہ جواں ہے خود ہی اسیر غم کہ مرے فراق کا ہے الم
جو سمجھ تو کم نہیں یہ ستم اسے چھوڑ دے تو خدا سے ڈر
تجھے کچھ بھی خوف خدا نہیں ترے دل میں رحم ذرا نہیں
یہ جفا تو اس پہ روا نہیں ترا دل ہے سنگ سے سخت تر
مرے ناتواں پہ نہ کر ستم مرے نیم جاں پہ نہ کر ستم
بس اب اس جواں پہ نہ کر ستم اسے چھوڑ دے مجھے قید کر

پیرزن

مرے چاہتا ہے یہ سو درم تمھیں دے دو پھر نہ کروں ستم
نہ ملیں درم تو یہ ہے قسم میں نہ چھوڑوں گی اسے عمر بھر

لیلیٰ (تھیلی روپوں کی پھینک کے)

ترے سو درم ہیں یہ اے ہوا مرا مبتلا ہو ابھی رہا
دل و جاں سے اس پہ ہوں میں فدا کوئی چیز یہ بھی ہے مال و زر

(قیس کا رہا ہونا ، پیرزن کا جانا)

مجنوں

مجھے قید سے تو رہا کیا حق دوستی تو ادا کیا
مگر اس کا سلسلہ کیا کیا کہ عذاب ہجر سے ہو مفر

مرا حال ہجر میں یہ ہوا تجھے آج تک ہے وہی حیا
رخ صاف سے تو نقاب اٹھا کہ فدا ہوں تیرے جمال پر

ترا نیم کشتۂ ناز ہوں میں شہید ناز و نیاز ہوں
میں اسیر زلف دراز ہوں تری قید میں ہوں میں سر بسر

رہا مدتوں میں اداس بھی ترے وصل سے ہوئی یاس بھی
نہ رہی تھی ملنے کی آس بھی تری یاد دل میں رہی مگر

لیلیٰ

نہیں اس میں کچھ بھی مری خطا ترے بخت کا یہ قصور تھا
ترے دل کو کیا نہیں یہ خبر ترے حال پر تھی میں نوحہ گر

ترے غم میں مَیں بھی ہوں مبتلا مگر اس میں کچھ نہیں بس مرا
اسی غم میں عمر ہوئی بسر کہ دعا ہماری ہے بے اثر

ترے چھوٹنے کا تو ہے الم مگر اب قریب ہے شام غم
نہ ٹھہر تو نجد میں ایک دم مرے باپ کو نہ ہو یہ خبر

(مجنوں لیلیٰ کی طرف نگاہِ حسرت سے دیکھ کر)

مجنوں

یہ فلک نے آہ کیا ستم تجھے دیکھنے بھی نہ پائے ہم

دم چند وہ جو تھے مغتنم گئے بات کہتے میں سب گزر

(لیلیٰ کا غائب ہو جانا ، مجنوں کا روانہ ہونا)

(تھوڑی دور جا کے شہر کے باہر)

نہ وہ جلوہ ہے ، نہ وہ یار ہے ، نہ وہ باغ ہے ، نہ بہار ہے
نہ وہ شہر ہے ، نہ دیار ہے ، نہ وہ کوچہ ہے ، نہ وہ بام و در
اسی دشت نجد کو چل دلا کہ نہ پردہ فاش ہو یار کا
ابھی اور کچھ دنوں صبر کر کہ یہاں ٹھہرنے میں ہے ضرر

چوتھا سین ـــــ راہِ صحرا

نہ[1] اس سے کچھ کہا نہ سنا شب غم کا کیا نہ گلا
نہ نکلا منہ سے کچھ بھی دلا ہوئے یوں محوِ حسن و ادا
کوئی پوچھے فلک سے کہ کیا ستانے سے ہمارے ملا
نہ دم بھر بھی یہ دیکھ سکا کیا ظالم نے ہم کو جدا
مرض تقدیر نے وہ دیا کہ ناپیدا ہے جس کی دوا
مقدر میں وصال نہ تھا کہ بالکل بے اثر ہے دعا
ہوئی دل کو پسند بلا نہ بھایا کچھ یہ کیا تھا بھلا
مجھے ہے دل سے اپنے گلا کسی کی نہیں ہے اس میں خطا

چوتھا سین ـــــ خوابگاہِ لیلیٰ

لیلیٰ

۱ـ صنف کلام : مطلع ، بحر وافر معصوب سالم ـ وزن : مفاعیلن مفاعلتن مفاعیلن مفاعلتن دو بار ـ قصد شاعر : اظہار اس حالت کا جو بعد دیکھنے لیلیٰ کے مجنوں کو حاصل ہوئی ـ

جو[1] کھایا ہے دل پہ داغ ستم جہاں میں کوئی کھا نہ سکے
آٹھایا وہ سر پر بارِ الم فلک بھی جسے آٹھا نہ سکے
چلی وہ جگر پہ تیغ ستم کہ زخم بھی ہم دِکھا نہ سکے
کہ چارہ گروں سے کہہ نہ سکے یہ حال کبھی سُنا نہ سکے
جو درد آٹھا تو آپ ہی آپ ضبط کیا کبھی نہ کہا
یہ حال کسی سے کہتے تو کیا کہ آف بھی زباں پہ لا نہ سکے
یہ سوزِ جگر یہ آتشِ غم اور اُس پہ یہ ضبط اور ستم
جو شعلہ آٹھا تو روئے نہ ہم یہ دل کی لگی بجھا نہ سکے
یہ حال ہوا کہ سوز نہاں نے آہ ہمیں جلا ہی دیا
یہ قہر ہوا اور اس پہ یہ ضبط رو نہ سکے رولا نہ سکے
یہ سنگ ستم یہ بار الم یہ عشق نے آہ قہر کیا
حیا نے یہ اور جبر کیا کہ آنکھ بھی ہم آٹھا نہ سکے
جو دوست کے غم میں درد ہوئے عدو کو بھی ہوں، خدا نہ کرے
جو ہوں بھی آسے تو چیخ آٹھے کبھی تو وہ تاب لا نہ سکے
جو قیس کے غم میں حال ہوا وہ دل میں رہا کبھی نہ کہا
جو رنج ہوا تو دل پہ سہا کہ اشک بھی ہم بہا نہ سکے
اگرچہ وہ حال چھپ نہ سکا کہ تاڑنے والے تاڑ گئے
غرض کہ ملال کھل ہی گیا کہ زردیٔ رخ چھپا نہ سکے
کبھی ہم آدھر کو جا نہ سکے کبھی وہ ادھر کو آ نہ سکے
جو کھینچ بھی لایا جذبۂ دل تو پاس آسے بلا نہ سکے
نہ اپنی کہی نہ آس کی سنی وہ ہو کے خفا چلا بھی گیا
حجاب سے ہم منا نہ سکے گلے بھی آسے لگا نہ سکے

---

[1] صنف کلام: غزل مسلسل، بحر وافر وافی سالم۔ وزن: مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن مفاعلتن، دو بار۔ قصد شاعر: اظہار کیفیات عشق۔

پانچواں سین ــ دشت نجد

وہی[1] دشت نجد ہے وہی کوہسار ہے
وہی ہجر یار ہے وہی جان زار ہے

وہی دل وہی ہوا وہی دشت کی فضا
وہی نجد کی ہوا وہی سبزہ زار ہے

وہی آہ نارسا وہی نالۂ زار ہے
اسے دل سے ساز ہے وہی غم‌گسار ہے

وہی یاس وصل ہے وہی منتشر حواس
وہی دل اداس ہے وہی انتشار ہے

وہی حسرت و الم وہی زندگی سے یاس
وہی آس موت کی وہی انتظار ہے

وہی اضطرابِ دل وہی یاد زلف یار
وہی پیچ و تاب ہجر وہی اضطرار ہے

وہی ہول ناک دشت وہی غول کی پکار
وہی دار و گیر ہے وہی مار مار ہے

وہی چاک چاک دل وہی تار تار جیب
وہی بار بار ذکر وہی یار یار ہے

چھٹا سین ــــ صحرا ۔ غارِ نجد (جائے قیامِ مجنوں)

(عبداللہ مجنوں کو تلاش کرتا ہے)

۱۔ صنف کلام : غزل مسلسل ، بحر طویل وافی مقبوض ۔ وزن : فعولن مفاعلن فعولن مفاعلن ، دو بار ۔ قصد شاعر : اظہار اُس کیفیت کا جو مدت دراز تک ایک ہی حالت میں رہنے سے پیدا ہوتی ہے جس کو اکتا جانا کہتے ہیں ۔

عبداللہ

تیرے[1] غم سے اے پسر! خوں ہوا میرا جگر
ڈھونڈھتا ہے یہ پدر تو کدھر ہے اے پسر

(عبداللہ اور مجنوں کی ملاقات)

عبداللہ

اے مرے آرامِ دل اے مرے لختِ جگر
اے مرے نورِ نظر اے مرے رشکِ قمر
یہ تنِ نازک ترا اور یہ دشت خار خار
اس مصیبت میں تجھے کس طرح دیکھے پدر

مجنوں

آہ و زاری سے تری ٹکڑے ہوتا ہے جگر
ڈھونڈھتا ہے کس کو تو کس لیے ہے نوحہ گر
کون ہے تو مبتلا کس لیے ہے بے قرار
کون ہے تو دل جلا کس لیے ہے چشمِ تر
تیری باتوں سے مجھے بوئے اُنس آتی ہے کچھ
اے شفیق مہرباں جن ہے تو یا ہے بشر
اے ضعیفِ ناتواں کس قدر ہے خوش بیاں
سچ بتا کیا میری لیلٰی کا ہے تو نامہ بر
بوے الفت آتی ہے تیرے جسمِ زار سے
خود بخود کھنچتا ہے دل بات میں ہے یہ اثر

۱- صنف کلام : غزل (یا قطعہ) مسلسل ، بحر مدید وافی سالم -
وزن : فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن ، دو بار - قصد شاعر : اظہارِ محبت
پدر و پسر -

عبداللہ

میں ہوں میں تیرا پدر مجھ کو بھی بھولا پسر
یہ جنوں کا ہے اثر یادِ لیلیٰ اس قدر!

مجنوں

اے پدر! اے مہرباں! قیس ہو تجھ پر فدا
دشتِ غم میں توکہاں ، اے مرے خستہ جگر!

دل ہی قابو میں نہ تھا کیا تجھے پہچانتا
سب یہ ہے دل کی خطا بخش دے تو اے پدر!

عبداللہ

کوہ و صحرا میں تجھے ڈھونڈھنے آیا ہوں میں
اس ضعیفی پر مری اے پسر تو رحم کر

پالنے والے کا دل کیوں نہ ہوئے پاش پاش
آہ وہ ناز و نعم اور یہ دشتِ پُر خطر

تیرے غم میں تیری ماں جاں بہ لب ہے ان دنوں
اس کی حالت غیر ہے دیکھ آ ، اے بے خبر!

میں ضعیف و زار ہوں زیست کا کیا اعتبار
کون ہے تیرے سوا مالکِ املاک و زر

تا کجا دیوانگی سیکھ اب فرزانگی
چھوڑ دے بیگانگی چل مرے ہمراہ گھر

باپ ماں کی خدمتیں قیس تجھ پر فرض ہیں
ترک کر ذکرِ صنم اب خدا کو یاد کر

قیس

قیس ہو تجھ پر فدا یہ سخن ہیں سب بجا
لائق صد شکر ہے یہ عنایت سر بسر

اے ولی نعمت مرے کافرِ نعمت ہوں میں
نا خلف ہے یہ پسر اس پسر سے در گزر
ناصحِ مشفق ہے تو یہ نصیحت ہے بجا
دل ہی کہنے میں نہیں کیا کروں میں اے پدر
آہ قابو میں نہیں یہ دلِ بے اختیار
آہ پہلو میں نہیں یہ دلِ وحشت اثر
جب نہ مانوں میں تو پھر یہ عنایت ہے عبث
جب نہ سمجھوں میں تو کیا ہو نصیحت کارگر
دردِ دل ہے لا دوا ترک کر تدبیر کو
یہ مرض ہے جاں ستاں چھوڑ دے تقدیر پر

عبداللہ

اے دل مایوس چل گفتگو بے کار ہے
راہ پر آتا نہیں ، آہ یہ شوریدہ سر

ساتواں سین ۔ محل سرائے عبدالعزیز

(لیلی کا دفعۃً دیوانہ ہو جانا)

لیلی

آتی[1] ہے فصل بہار آہ کوئی کیا کرے
جب نہ ہو پہلو میں یار آہ کوئی کیا کرے
دل پہ نہیں اختیار آہ کوئی کیا کرے
جبکہ ہو یہ اضطرار آہ کوئی کیا کرے

۱۔ صنف کلام : غزل (مرتعی) بحر بسیط واقی مطوی ۔ وزن : مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن ، دو بار۔ قصد شاعر : شدت اضطراب و اضطرار۔

(لیلیٰ بھاگنے کا قصد کرتی ہے)

گھر سے نکل جاؤں میں قیس کو دیکھ آؤں میں
دل کو نہیں ہے قرار آہ کوئی کیا کرے

(مادرِ لیلیٰ قریبِ دروازہ لیلیٰ کو پکڑ لیتی ہے)

مادر لیلیٰ

کیا ہوا لیلیٰ تجھے کیا ہوا بیٹی تجھے
بکتی ہے کیوں بار بار ' آہ کوئی کیا کرے '

آتا ہے تیرا پدر کہتی ہوں سب اس سے حال
سر پر جنوں ہے سوار آہ کوئی کیا کرے

(عبدالعزیز آتا ہے)

اس کو یہ کیا ہو گیا تم کرو اس کی دوا
بکتی ہے دیوانہ وار ' آہ کوئی کیا کرے '

روک نہ لیتی جو میں گھر سے گئی تھی ابھی
سخت ہوا انتشار آہ کوئی کیا کرے

عبدالعزیز

ہے یہ جنوں کا اثر قید ہے اس کا علاج
گو کہ یہ ہو ناگوار آہ کوئی کیا کرے

قید کروں گا اسے لوہے کی زنجیر میں !
پاؤں اگر ہوں فگار آہ کوئی کیا کرے

(عبدالعزیز لیلیٰ کے پاؤں میں زنجیر پنھاتا ہے)

لیلیٰ

پاؤں میں زنجیر ہے طوق گلوگیر ہے
سلسلۂ زلفِ یار آہ کوئی کیا کرے

آٹھواں سین ـــــ دشتِ نجد

مجنوں

دیکھیے[1] عالم تقدیر سے کیا ہوتا ہے
لاکھ تدبیر ہو، تدبیر سے کیا ہوتا ہے
کھینچ ہی لائے گا اک روز اسے جذبۂ دل
زندگی چاہیے تاخیر سے کیا ہوتا ہے
دل کو زلفوں میں پھنساؤ کہ یہ قید اچھی ہے
ایسے دیوانوں کو زنجیر سے کیا ہوتا ہے
اب سنا ہے کہ جفا سے بھی پشیمان ہے وہ
اور پھر آہ کی تاثیر سے کیا ہوتا ہے
گوش مشتاقِ سخن دل متمنئی وصال
تو ہی کہہ دے تری تصویر سے کیا ہوتا ہے

۱ـ صنف کلام : غزل بحر رمل وافی مخبون مسکن محذوف - وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن دو بار - کہیں پر رکن آخر فعلان (مقصور) اور کہیں فعلن بحرکت عین (محذوف) لے لیا ہے - قصدشاعر: اظہار اس امر کا کہ گویا مجنوں کے دل کو اس واقعے کی خبر ہے بلکہ اس کو امور آیندہ کی بھی اطلاع ہے - اگر یہ تسلیم کر لیا جائے جیسا کہ واقعات سے ظاہر کیا گیا ہے کہ مجنوں اور لیلیٰ میں شرکت خیال واقع تھی تو یہ امر مستبعد معلوم نہ ہوگا کہ مجنوں کو لیلیٰ کے ارادے پر اطلاع حاصل تھی - لیلیٰ کا ارادہ ہے کہ زندان سے بھاگ جاؤں اور قیس کو دیکھ آؤں اور اس سے قیس آگاہ ہے - ایسے امور معمولات اور مجانین میں اکثر مشاہدہ کیے گئے ہیں -

بے حجابانہ ملیں آپ، تکلّف کیسا
اس مدارات سے توقیر سے کیا ہوتا ہے

کچھ کھٹک سی ہے کلیجے میں مگر زخم نہیں
کیا بتائیں کہ ترے تیر سے کیا ہوتا ہے

کوئی بھی اس نگہِ ناز سے جاں بر نہ ہوا
تیر ایسا ہو تو نخچیر سے کیا ہوتا ہے

دوست کی جس پہ عنایت ہو جواں بخت ہے وہ
پھر عناد فلک پیر سے کیا ہوتا ہے

کیا سنائیں تمھیں افسانۂ ہجرِ کاکل
ایسی الجھی ہوئی تقریر سے کیا ہوتا ہے

بخت اگر بد ہو تو سونے کو بنا دے مٹی
اے مہ وش! تری اکسیر سے کیا ہوتا ہے

عشق کاکل یہ وہ سودا ہے کہ جاتا ہی نہیں
مار سے، قید سے، زنجیر سے کیا ہوتا ہے

دیکھتی ہی نہ چلی آئیں تو کچھ بات نہیں
دیکھ مرزا تری تحریر سے کیا ہوتا ہے

نواں سین زندان خانہ

لیلیٰ (خود بخود)

آج[1] قسمت سے در زنداں کھلا
سو گئے در چھوڑ کر درباں کھلا

۱۔ صنف کلام: غزل، بحر رمل مجز و محذوف یا مقصور۔ وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، دو بار۔ اور جہاں قصر ہے وہاں فاعلان۔ قصد شاعر: اظہار اس حالت کا جو آزاد ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

بعد مدّت کے بر آئی آرزو
کیا نصیب اپنا دلِ حیراں کھلا

قید میں کب تک رہوں میں تنگ دل
اے جنوں دکھلا کوئی میداں کھلا

آج اجرِ سعیِ بے حاصل ملا
غیب سے دروازۂ احساں کھلا

میں تو کہتی تھی الٰہی خیر ہو
مجھ سے کیوں میرا دل ناداں کھلا

کیا خبر تھی خوبیِ تقدیر کی
آج بخت حسرت و ارماں کھلا

جذب دل کو بے اثر سمجھی تھی میں
آج رمز پرسش پنہاں کھلا

نالہ و فریاد کب تھی بے اثر
آج اعجازِ دلِ نالاں کھلا

کھل گیا حال تمنائے محال
اب مآل عشق بے ساماں کھلا

(لیلیٰ کا زنداں سے نکل جانا)

دسواں سین—کوچہ و بازار

لیلیٰ (خود بخود)

اے[1] عشق! دکھا مجھ کو راہ صحرا
اے شوق! بتا مجھ کو راہ صحرا

۱۔ صنف کلام : ابیات ، بحر قریب وافی اخرب مکفوف سالم۔ وزن : مفعول مفاعیل فاع لاتن ، دو بار۔

اے قیس ! تجھے پاؤں کس طرح میں
اے جذب ! وہاں جاؤں کس طرح میں

گیارھواں سین —— بیرون شہر

لیلیٰ (خود بخود)

رخصت[1] اے حب الوطن ! لے جاتے ہیں ہم
فرصت اے سیر چمن ! دے جاتے ہیں ہم
نجد میں اب ہم کو پہنچا اے جذب دل !
قیس کو اب جلد دکھلا اے جذب دل !

بارھواں سین —— صحرا

(لیلیٰ قیس کو تلاش کرتی ہے)

لیلیٰ (خود بخود)

بلائے[2] جاں مرا جوبن بنا کے
پھرایا عشق نے جوگن بنا کے

دیے ہیں آنسوؤں کے موتیوں سے
یہ مالے اور یہ سمرن بنا کے

پنھایا ہے مجھے پھولوں کا گہنا
دلِ پُر داغ کو گلشن بنا کے

۱- صنف کلام : ابیات بحر جدید واقی سالم ۔ وزن : فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن دو بار ۔ قصد شاعر : اظہار اس امر کا کہ جذب شوق آخر حبِّ وطن پر بھی غالب آیا ۔

۲- صنف کلام ۔ غزل مسلسل ، بحر ہزج مجز و محذوف یا مقصور ۔ وزن : مفاعیلن مفاعیلن فعولن ، قصد شاعر : اظہار انداز حسن و عشق بہ یک بار ۔ لیلیٰ معشوق ہے اور مجنوں کے جذب شوق نے اس کو عاشق بنا دیا ہے ۔ اس کی نازک جان ، اس کے عاشق تن ہونے کی وجہ سے کیا کیا صدمے اٹھا رہی ہے ۔

کوئی دیکھے تو اس زلف سیہ کو
یہ کس نے چھوڑ دی ناگن بنا کے

کیا ہے دل پریشاں کس بلا نے
مجھے خود کاکل پر فن بنا کے

پھراتا ہے کسی کا جذب الفت
مرے دل کو مرا دشمن بنا کے

اتارا عشق نے وہ بھاری گہنا
پنھایا زیور آہن بنا کے

کسی کے عشق میں دھونی رمائی
دل پر داغ کو گلخن بنا کے

عجب آتا ہے اپنے دل پہ مجھ کو
بنایا موم اسے آہن بنا کے

جلایا شمع کی مانند اک عمر
مجھے خود شعلۂ روشن بنا کے

بنا بوٹا سا قد سرو چراغاں
جلایا زینت گلشن بنا کے

مٹاتی ہے مجھے کیوں میری تقدیر
بگڑ جاتی ہے یوں بھی بن بنا کے

کسی کی آتش غم ہائے کیا کیا
تپاتی ہے مجھے کندن بنا کے

یہ صدمے اور نازک جان میری
مٹایا مجھ کو عاشق تن بنا کے

کیا فتنے کو دامن گیر میرا
قضا نے گوشۂ دامن بنا کے

کیے ہیں دفن ارمان کیسے کیسے
دلِ آباد کو مدفن بنا کے

فراق یار میں جب آئی برسات
رُلایا خود ہمیں ساون بنا کے

وہ چہرہ جو کبھی تھا ارغوانی
کیا نیلا گلِ سوسن بنا کے

صبا کی طرح سے پھرتی ہوں بن بن
ہوائے یار کو تو سن بنا کے

پھراتا ہے جنوں صحرا بہ صحرا
بہار باغ کو جوگن بنا کے

تیرھواں سین — وادیٔ نجد (مسکن مجنوں)

مجنوں (خود بخود)

نہیں[۱] میرے سوا کوئی، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
نہیں ہے دوسری لیلیٰ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

میں ہوں عاشق، میں ہوں رسوا، میں ہوں وہ یار بے پروا
یہ عشق اور عاشقی کیسی، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

۱۔ صنف کلام: غزل بحر ہزج وافی سالم۔ وزن: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن، دو بار۔ قصد شاعر: اظہار حالت فنا فی العشق جس کو ''اتحاد'' کہتے ہیں۔ اس حالت کے بارے میں دو مذہب ہیں۔ وحدت وجود والے تو یہ کہتے ہیں کہ اس حالت میں یہ بھی ممکن ہے کہ عاشق و معشوق دونوں واقعے میں ایک ہو جائیں اور کسی قسم کی دوئی نہ رہے۔ اور وحدت شہود والے صرف اس کے قائل ہیں کہ یہ حالت شدت استغراق اور جذب میں طاری ہو سکتی ہے مگر واقعے میں شاہد و مشہود ایک نہیں ہو جاتے اور اس کو محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے بھی تسلیم کیا ہے (دیکھو رسالہ ''اوصاف الاشراق'')

نہ اب ہے شمع و پروانہ ، جلانا ہے نہ جل جانا
فقط شعلہ ہے اب باقی ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
نہ وہ شمع جمال اب ہے نہ فانوس خیال اب ہے
نہ اب دوری ، نہ اب صوری ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
جو میرا ہے وہ تیرا ہے کہ جو تو ہے وہی میں ہوں
وہی مجنوں ، وہی لیلیٰ ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
نہ وصلت ہے، نہ فرقت ہے، نہ آلفت ہے، نہ حسرت ہے
نہ ذلت ہے ، نہ رسوائی ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
نہ اب گل ہے ، نہ بلبل ہے ، نہ اب صیاد گلچیں ہے
بہار بے خزاں آئی ، اِنا لیلیٰ انا لیلیٰ
شراب عشق میں خود ہوں ، خراب عشق میں خود ہوں
میں ہوں ساغر ، میں ہوں ساقی ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

(لیلیٰ آتی ہے)

لیلیٰ

یہ[1] کیا کہتا ہے تو مجنوں 'انا لیلیٰ انا لیلیٰ'
ارے تو ہے مرا شیدا ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

۱- صنف کلام : غزل مرصع ، ردیف واحد ، قوافی مختلف - شیخ سعدی کی یہ غزل بھی اسی طرز میں ہے :

اے ماہ عالم سوز من از من چرا رنجیدهٔ
وے شمع شب افروز من از من چرا رنجیدهٔ
یک شب ترا مہماں کنم تا جان و دل قرباں کنم
جائے تو در چشماں کنم از من چرا رنجیدهٔ
رنجیدهٔ رنجیدهٔ از من خطا چه دیدهٔ
دائم خطا بخشیدهٔ از من چرا رنجیدهٔ
من سعدیٔ دلخواه تو ابروئے تو چوں ماه نو
من یار نیکو خواه تو از من چرا رنجیدهٔ

مرے عاشق ، مرے شیدا ، میں ہوں معشوق بے پروا
مجھے ہے یہ سخن زیبا ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

وہ یار نازنیں ہوں میں ، حسین مہ جبیں ہوں میں
جو تو ہے وہ نہیں ہوں میں ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

کہاں مجنوں ، کہاں لیلیٰ ، ذرا صورت تو دیکھ اپنی
جو ہو صاف آرسی دل کی ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

یہ کیسی خود نمائی ہے ، یہ کیا دل میں سمائی ہے
یہ کیا نا آشنائی ہے ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

مجنوں

ابھی کس کی صدا آئی کہ دل ہے جس کا سودائی
یہاں لیلیٰ کہاں آئی ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

لیلیٰ

یہ ہے دیوانہ پن تیرا ، یہ ہے مستانہ پن تیرا
یہ ہے بیگانہ پن تیرا ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

یہ باتیں چھوڑ اے ناداں ! جنوں کا ہے یہ سب ساماں
سنبھال اپنا دل حیراں ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۴

اس غزل کی نسبت بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ غیر مقفیٰ ہے ، (اور صاحب منتہی العروض'' بھی انھیں میں سے ہیں) حالانکہ یہ غلط ہے ، یہاں ہر ایک شعر میں تین تین قافیے موجود ہیں اور ردیف ایک ہے ، یہ بھی کچھ ضرور نہیں کہ تینوں قافیے لفظاً مختلف ہوں مگر دو قافیوں کا اختلاف ضروری ہے ، اور یہ بھی لازم ہے کہ ایسے دو قافیے یکے بعد دیگرے واقع ہوں تاکہ وہ قیتین جو لفظاً متحد ہیں ، ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں ۔ مثلاً شیخ سعدی کی غزل مرقومہ کا چوتھا شعر ۔ لیکن اگر تینوں قافیے لفظاً مختلف ہوں تو مستحسن ہے ۔ بحر اور وزن کے لیے گزشتہ حاشیہ دیکھیے ۔ قصد شاعر : لیلیٰ کی زبانی اظہار عجب کسی قدر غصے کے ساتھ ، مجنوں کی طرف سے معذرت ۔

جنوں کے طور ہیں بےشک نہیں ہوتی خبر اب تک
پکاروں میں تجھے کب تک ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
پکار آ کر تو وحشت کو نہ کر بدنام اُلفت کو
لگے آگ اس محبت کو ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

مجنوں

نہ ہو اتنا خفا دلبر جنوں کے جوش میں اکثر
کہا کرتا ہوں میں مضطر ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ
یہ تھا سب وہم کا دھوکا ، تجھے اب میں نے پہچانا
غلط ہے یہ مرا دعویٰ ، انا لیلیٰ انا لیلیٰ

مجنوں

(غزل)

واہ[1] کیا خوبی و رعنائی و زیبائی ہے
تجھ کو زیبا ہے جو یہ دعوائے یکتائی ہے

چشم جادو کا ترے کون نہیں ہے بیمار
نرگس باغ کو بھی حسرت بینائی ہے

تو جو آئی تو خوشی سے میں ہوا شادی مرگ
واہ کیا نیک بہانے سے اجل آئی ہے

آئیے مجھ کو جلا لیجیے میں مرتا ہوں
سنتے ہیں آپ کو دعوائے مسیحائی ہے

کیا شب ہجر کا احوال کہوں میں تم سے
کوئی تارہ نہ رہا جب مجھے نیند آئی ہے

۱۔ صنف کلام : غزل بحر رمل وافی مخبون مسکن محذوف وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن دو بار ۔ بعض مصرعوں میں رکن آخر مقصور فعلان لے لیا ہے ۔ قصد شاعر : اظہار بہجت شکر و شکایت ۔

شوق کہتا تھا کہ جو کچھ ہو درِ یار پہ چل
عقل کہتی تھی جنوں ہے تجھے سودائی ہے

آج کل تم کو بہت ہے مری خاطر منظور
یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

بوسہ دیتے نہیں پھر دل تمھیں کس بات پہ دیں
صاحب اتنا تو سمجھیے کوئی سودائی ہے

کیا تماشا ہے کہ خلوت میں تو شرماتے ہو
اور محفل میں کوئی جائے تو رسوائی ہے

لیلیٰ

کیا ہوا آج جو ملنے کی قسم کھائی ہے
کل وہی تم وہی ہم اور وہی رسوائی ہے

جذب الفت کا اثر دیکھ تو اے قیس ذرا
تیرے ملنے کی ہوس مجھ کو یہاں لائی ہے

یہ ترا خط ہے نہ رکھوں اسے کس طرح عزیز
نقدِ جاں میں نے گنوا کر یہ رقم پائی ہے

کوئی دم کے لیے صحرا کی ہوا کھاتی ہوں
پھر وہی کنج قفس ہے وہی تنہائی ہے

باپ ماں کھینچ کے لے جائیں گے مجھ کو یاں سے
پھر وہی ذلّت و خواری وہی رسوائی ہے

پھر ہوس تیری نکالے گی مجھے زنداں سے
کہ وہی میں ہوں وہی یہ دلِ سودائی ہے

پھر وہی لالۂ صحرا وہی جنگل کی ہوا
پھر وہی میں ہوں وہی بادیہ پیمائی ہے

جان پر کھیل کے آئی ہوں یہاں تک اے قیس
دشتِ پُر خار میں لیلیٰ کو قضا لائی ہے
مجھ کو سونے دے اب اے قیس کہ جاگی ہوں میں
غش کے آثار ہیں یا کہ مجھے نیند آئی ہے

(لیلیٰ کا بے خبر سو جانا)

مجنوں (خود بخود)

آج[1] مہ رُو سے مرے گرم ہے پہلو میرا
جس کے قابو میں ہے دل اُس پہ ہے قابو میرا
ذوق مستی ہے مجھے بے سر و سامانی میں
ساقیا بھر دے مئے ناب سے چُلّو میرا

چودھواں سین ——— صحرا (وادیٔ نجد)

مادر لیلیٰ

کہاں[2] ڈھونڈھے تجھے مادر مری لیلیٰ مری لیلیٰ
نہ تجھ کو پاس عزت ہے نہ تجھ کو پاس حرمت ہے
بڑی تو بے مروت ہے مری لیلیٰ مری لیلیٰ

(لیلیٰ کو دیکھ کے)

یہی تو ہے مری دختر پڑی ہے غش میں یہ مضطر
اسے اب لے چلوں میں گھر مری لیلیٰ مری لیلیٰ
یہی ہے قیس دیوانہ اسے بھی ہوش ہے یا نہ؟
ہے اپنی دھن میں مستانہ - - - - - - - - - - -

۱- صنف کلام : غزل (دو شعر) بحر و وزن : مثل غزل سابق - قصد شاعر : اظہار اس مسرت کا جو کامیابی سے حاصل ہوتی ہے -
۲- صنف کلام : غزل مسلسل مع بحر و وزن و قافیہ کے لیے دیکھیے صفحہ ۱۳۳ -

(لیلیٰ کو گود میں اٹھا کے)

- - - - - - - - - - مری لیلیٰ مری لیلیٰ

مجنوں (ہوش میں آ کے)

کیا[۱] ابھی پہلو میں میرے وہ بت طنّاز تھا
کچھ فریب حسن تھا یا عشق کا اعجاز تھا

۱- صنف کلام : غزل بحر رمل وافی محذوف یا مقصور - وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دو بار اور جہاں قصر ہے وہاں رکن آخر فاعلان ہے - قصد شاعر :- اظہار اس امر کا کہ مجنوں اس گزشتہ واقعے کو خواب و خیال سمجھا - مجنوں تو خیر دیوانہ تھا ، بڑے بڑے حکمائے (اهل تصور) اس حیرت میں ہیں کہ اس بڑے کارخانے کے تماشے جو ہمارے پیش نظر ہیں ، کوئی حقیقت ان کی واقعے میں ہے یا یہ سب ہمارے ذہن کے اختراعات ہیں - ہم نے ان جھگڑوں کو ایک غزل میں بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے :

غزل

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے
وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دنیا کیا ہے
ہم نے مانا کہ یہ سب وہم ہے اے متکر ذات !
تو ہی کہہ دے کہ پھر اس وہم سے ہوتا کیا ہے
تو یہ کہتا ہے ہیولیٰ کے یہ سب دھوکے ہیں
پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکا ہے یہ دھوکا کیا ہے
یعنی دیکھا نہ ہو جس کو اسے ہم کیوں مانیں
اک ذرا غور تو کر جی میں تو کہتا کیا ہے
تو نے دیکھا ہے انرجی و ہیولیٰ کو کبھی
پھر جو قائل ہے تو ان کا تجھے سودا کیا ہے
بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی
تجربہ ، ہم کو بتا دے ، کہ بتاتا کیا ہے
مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا
پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے
اس کا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن
پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

تھا ابھی اُس شعلہ خو سے خواب میں راز و نیاز
کھل گئی جب آنکھ تو نےَ سوز تھا نےَ یاز تھا
دل میں چٹکی لی کسی نے آہ کیا آفت ہوئی
بخت خفتہ خواب میں بھی تفرقہ انداز تھا

پندرھواں سین محل سرائے عبدالعزیز

لیلیٰ[1]	کون لایا مجھے ؟	مادر لیلیٰ	یہ ہے میری خطا
ایضاً	کیوں ستایا مجھے	ایضاً	چپ ہو او بے حیا !
,,	جان دوں تو سہی	,,	خوب ہے مر کہیں
,,	دل میں ہے اب یہی	,,	مجھ کو پروا نہیں
,,	قید سے فائدہ ؟	,,	جان لوں گی تری
,,	کوئی مر جائے کیا؟	,,	یہ خوشی ہے مری
,,	دل پہ قابو نہیں	,,	کاش مر جائے تو
,,	دل لگا ہے وہیں	,,	اب اگر جائے تو
		,,	مار ڈالوں تجھے
,,	مجھکو منظور ہے		
,,	جانے دو تم مجھے	,,	اب وہ دن دور ہے
,,	ہائے میں کیا کروں	,,	زھر کھا لے کہیں
,,	میں ابھی کھابھی لوں		
,,	ہائے ملتا نہیں		
,,	دم نکلتا نہیں	,,	میں گلا گھونٹ دوں؟

۱- صنف کلام : ابیات (خطابی) بحر متدارک وافی سالم - وزن : فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن دوبار - قصد شاعر : لیلیٰ کی زبانی اظہار ملال دیوانگی کے پہلے سے ، مادر لیلیٰ کی طرف سے طعن و تشنیع و توبیخ ۔

لیلٰی   گھونٹ بھی دوکہیں   مادرِ لیلٰی   سر پہ کیوں خون لوں
،،   پھر نکل جاؤں گی   ،،   دل میں کیا آئی ھے
،،   دیکھو کل جاؤں گی   ،،   کیوں قضا آئی ھے
،،   دائی مرتی ھوں میں   ،،   دیر بے کار ھے
،،   ھائے مرتی ھوں میں   ،،   قبر تیار ھے

سولھواں سین ــــ بیمار خانہ

دردِ دل[1] کا علاج کیا ھوتا
رو بہ صحت مزاج کیا ھوتا

عشق نے کام ھی تمام کیا
لو طبیبوں نے بھی جواب دیا

اس مرض سے ھوئی شفا نہ ھمیں
راس آئی کوئی دوا نہ ھمیں

بس اجل ھی دوائے عاشق ھے
قبر دار الشفائے عاشق ھے

سترھواں سین ــــ وادیٔ نجد

(ایک راہ گیر)

کون[2] ھے یہ جوان زار و نزار

۱۔ صنف کلام : مثنوی بحر خفیف وافی مخبون مسکن محذوف ۔ وزن : فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔ دو بار قصد شاعر : اظہار علالت ۔

۲۔ صنف کلام ۔ ایضاً بحر و وزن ایضاً ۔ بعض مصرعوں میں رکن آخر مقصور لے لیا ھے (فعلان) ۔ قصد شاعر : معشوق کی علالت کی خبر سن کے عاشق کے دل میں کیا خیالات پیدا ھوئے، ”کاش اے دل طبیب ھوتا میں“ اس مصرع کا مضمون قیس کے دیوان سے لیا ھے ۔

دوسرا راہ گیر

ہے یہ لیلٰی کا عاشق بیمار

سنتے ہیں ہم مریض ہے لیلی

پہلا

آؤ مجنوں کو دیں خبر اس کی

دیکھیں کیا کہتا ہے یہ دیوانہ

ہوش بھی اس کو آتا ہے یا نہ؟

دوسرا

مفت کیوں خون لیتے ہو سر پر

مر نہ جائے یہ عاشق مضطر

پہلا

جس کسی کو ہو عشق کا آزار

اس کا مرنا ہی خوب ہے اے یار

(مجنوں سے مخاطب ہو کر)

اے مریضِ محبتِ لیلٰی!

اے طلب گارِ وصلتِ لیلٰی!

سخت بیمار ہے وہ غیرتِ ماہ

اس کے احوال سے بھی ہے آگاہ؟

مجنوں

کیا سناتا ہے اے فلک مجھ کو

کیوں ستاتا ہے اے فلک مجھ کو

کاش اے دل! طبیب ہوتا میں

غم گسار حبیب ہوتا میں

فکر تیمار دل رُبا کرتا
کچھ نہ کچھ اُس کی میں دوا کرتا
بس نہیں ہے کہ اُڑ کے جاؤں میں
اک نظر اس کو دیکھ آؤں میں
اب کہاں صبر جانِ بسمل کو
سخت تشویش ہے مرے دل کو
گوکہ مجھ کو خدا سے ہے اُمید
یعنی اپنی دعا سے ہے اُمید
یہ بلا اُس کے سر سے ٹل جائے
پہلے اُس سے مجھی کو موت آئے

اٹھارھواں سین۔ محل سرائے عبدالعزیز

(لیلٰی کا دم واپسیں)

لیلٰی

ہم[۱] نہیں اُن میں جو ہیں موت سے ڈرنے والے
اس کا غم کیا یونہیں مر جاتے ہیں مرنے والے
ہو کے مایوس دیا چارہ گروں نے بھی جواب
زخم دل کے نہ تھے ایسے جو ہوں بھرنے والے
ہے خوشی موت کی ، خود زیست سے بیزار ہیں ہم
دم ٹھہر جائے تو ہم کب ہیں ٹھہرنے والے

۹۴۔ صنف کلام : غزل مسلسل مرقعی بحر رمل وافی مخبون مسکن محذوف یا مقصور۔ وزن : فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن دو بار۔ قصد شاعر : ۱ایک وفادار معشوق کا خاتمہ بالخیر۔ لیلیٰ اپنی موت سے خوش ، اپنے عزیزوں سے ناراض گئی ۔ اعتراف محبت ، وصیت ۔

(عزیزوں سے مخاطب ہو کر)

اب تو ٹھنڈک پڑی جی میں کہ ہوئے ہم برباد
آج تو خوش ہوئے الزام کے دھرنے والے

ہائے رہ رہ کے کلیجے میں دھؤاں آٹھتا ہے
آج کیوں چپ ہوئے کہہ کہہ کے مکرنے والے

لو کہے دیتے ہیں ہم قیس پہ دم دیتے تھے
اب کدھر بیٹھے ہیں رسوا ہمیں کرنے والے

پاک آلفت تھی ہمیں ، اس کا خدا عالم ہے
پاک دل ہوتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے

غسل میت مجھے دیتا ہے مرا دیدۂ تر
دیکھو اس طرح نکھرتے ہیں نکھرنے والے

قبر تک جائیں گے اسباب پریشانی کے
بعد مُردن بھی یہ گیسو ہیں بکھرنے والے

کیا عجب میرے جنازے پہ کہیں اہل نظر
ہم نے دیکھے نہیں ایسے کبھی مرنے والے

آجلا آجلا وہ کفن اور وہ پھولوں کی مہک
مر کے بھی آہ سنورتے ہیں سنورنے والے

میرے مجنوں کو مرے بعد یہ دینا پیغام
اے محبت میں مری حد سے گزرنے والے

تجھ پہ لیلٰی ہوئی قربان تری جان سے دور
دیکھ یوں بات پہ مر جاتے ہیں مرنے والے

’بے وفا‘ تو تو کہا کرتا تھا ہم کو اے قیس
تو سلامت رہے اے نام کے دھرنے والے

تو ہی کہہ دے کہ وفا اور کسے کہتے ہیں ؟
عمر بھر نام پہ بیٹھے رہے بھرنے والے
بیچ منجدھار میں اُلفت نے ڈبویا ہم کو
ہم نہ تھے اُن میں جو ہیں پار اترنے والے
حشر کے دن تجھے اللہ سے لیں گے اے قیس
صبر کر صبر کر یہ دن ہیں گزرنے والے
تو نہ کڑھنا تجھے میری غمِ الفت کی قسم
اس کا غم کیا یونہیں مر جاتے ہیں مرنے والے

(لیلیٰ کا مر جانا)

آنیسواں سین ــــ عزا خانۂ صف ماتم ، تابوتِ لیلیٰ

(نوحہ مادر لیلیٰ)

مر گئی[1] لیلیٰ جواں ، ہائے یہ کیا ہو گیا
ہو گئی برباد ماں ، ہائے یہ کیا ہو گیا
موت کی تھی دل میں یاد ، مرنے سے تھیں شاد شاد
آہ مری نا مراد ، ہائے یہ کیا ہو گیا
اے مری غنچہ دھن ، ہائے مری کم سخن
اے مری گل پیرھن ، ہائے یہ کیا ہو گیا

۱- صنف کلام : نوحہ ، بحر منسرج وافی مطوی مکسوف یا موقوف ۔ وزن : مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن دو بار ۔ جہاں وقف ہے وہاں پر فاعلن کی جگہ فاعلان ہے ۔ قصد شاعر : مادر لیلیٰ کی زبانی اعتراف قصور ۔ لیلیٰ مجنوں کے وصال میں کوئی مانع نہ تھا سوائے ضد اور تعصب اور نفاق کے جو اس گھرانے میں واقع تھے اور غیرت کے پیرائے میں ظہور پزیر ہوئے ، کوئی امر شرعی مانع نہ تھا ۔

مصنف کے نزدیک مناسب ہے کہ یہ واقعہ (یعنی لیلیٰ کا مرنا) پردے کے اندر سے واقع ہو (مرتب)

قیس سے تجھ کو چھڑا لانے کی پائی سزا
سب ہے یہ میری خطا ہائے یہ کیا ہو گیا
خاک میں مل جائے ماں مجھ سی نہیں ناشاد ماں
مر گئیں کڑیل جواں ، ہائے یہ کیا ہو گیا

بیسواں سین ـــــ دشت نجد

مجنوں

کچھ[۱] آج سوا ہے بے قراری
کیوں آہ یہ کیا ہے بے قراری

آتی ہے صدائے شور و شین
ہے ہے کیا دل خراش ہیں بین

ہے آج یہ درد متصل کیوں
امڈا آتا ہے مرا دل کیوں

آگے تو نسیمِ کوئے جاناں
لاتی تھی شمیمِ زلفِ پیچاں

سنبل کی مہک فدا ہو جس پر
قرباں ہو بوئے مشک عنبر

تسکیں ہوتی تھی درد دل کو
گویا کھوتی تھی درد دل کو

ہے آج ہوا میں بوئے کافور
کیا کہتا ہوں اس کی جان سے دور

۹۔ صنف کلام : مثنوی (مرقعی) بحر ہزج مجز و اخرب مقبوض محذوف یا مقصور۔ وزن : مفعول مفاعلن فعولن یا فعولان دو بار اور بعض مصرعے بحر ہزج مجز و اخرام اشتر محذوف یا مقصور۔ وزن : مفعولن فاعلن فعولن یا فعولان۔ قصد شاعر : اظہار اس امر کا کہ مجنوں کو خود بخود مرگ لیلیٰ کی خبر ہو گئی اور پھر جب اس خبر کی تصدیق زبانی راہ گیر کے ہوئی تو اس کا کیا حال ہوا ۔

اے دل کس کا جنازہ اٹھا
شاید میرا جنازہ اٹھا

کیسی یہ ہچکیاں ہیں پیہم
اٹھتا ہے دل سے شورِ ماتم

کیوں دل ہے مرا اداس اداس آج
جینے سے ہے اپنے مجھ کو یاس آج

آثار یہ بد ہیں اے دلِ زار
سنتا ہوں کہ وہ صنم ہے بیمار

کانٹا سا کھٹک رہا ہے دل میں
شعلہ سا لپک رہا ہے دل میں

لیلیٰ کا مری حال کیا ہے
ہے ہے یہ مجھے خیال کیا ہے

(دو شخص راہ گیر آتے ہیں)

ایک راہ گیر

دیکھو یہ قیس مبتلا ہے
لیلیٰ پہ یہ نیم جاں فدا ہے

دوسرا

یہ عشق نہیں جنوں ہے بے شک
وہ مر گئی یاں نہیں خبر تک

مجنوں

اے حیرت عشق ہوش میں آ
اے غیرت عشق جوش میں آ

کیا کہتے ہیں لوگ آہ مجھ کو
سننے کی نہیں ہے تاب مجھ کو

ھے ھے کیا سخت زندگی ھے
کیسی کم بخت زندگی ھے

لے تیرا برا ھو سخت جانی
لیلٰی کی بھی آ گئی سنانی

اب تک نہیں ھائے موت آتی
اب تک نہیں ھائے جان جاتی

دیکھوں میں تیری قبر لیلٰی
کیونکر ھو دل کو صبر لیلٰی

یہ دن تو مجھے خدا نہ دکھلائے
پہلے تجھ سے مجھی کو موت آئے

اے دل ! لے چل تو جانب "حے"
دیکھوں تو کیا یہ ماجرا ھے

اکیسواں سین—— کوچۂ و بازار نجد

مجنوں (خود بخود)

درد[1] اور اس پر یہ دل کی بے قراری ھائے ھائے

(حالت اضطرار میں)

عشق اور آس پر یہ نا امیدواری ھائے ھائے

۱۔ صنف کلام : غزل مسلسل ، بحر رمل وافی مقصور یا محذوف وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان یا رکن آخر فاعلن ۔ قصد شاعر : نوحہ و فریاد ، شدت الم و اضطراب ، اپنے عشق سے بد گمانی ۔ خود بخود جذب عشق کی مدد سے قبر کا ڈھونڈھ نکالنا ، لیلیٰ کی قبر اور تصور سے باتیں کرنا ۔ تڑپ تڑپ کر جان دینا ، باغبان کی زبانی اظہار مرگ مجنوں ، نتیجہ عشق مجازی ۔ واقعہ یہ ھے کہ جب مجنوں نے لیلیٰ کی سنانی وادیٔ نجد میں سنی تو وہ روتا پیٹتا ، بہ حالت زار و دل بے قرار (محلہ لیلیٰ) کی طرف چلا ؛ یہاں پہنچ کر ھر ایک سے قبر لیلیٰ

عمر بھر تڑپا کیے ہم عمر بھر رویا کیے
کیا بری تھی اے فلک قسمت ہماری ہائے ہائے
شمع جل کر گل ہوئی پروانہ جلتا ہی رہا
سوز غم دیکھی تری امید واری ہائے ہائے
ڈھونڈھتا[۱] پھرتا ہوں تربت کا پتا ملتا نہیں
بے اثر تھی آہ میری سوگواری ہائے ہائے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۲

کا پتا دریافت کرتا تھا ، مگر کوئی نہیں بتاتا تھا ۔ وجہ اس نہ بتانے کی والبی نے نہیں لکھی ۔ بہ‌ظاہر دو وجہیں ہیں ، یا تو یہ کہ مجنوں کے مر جانے کا خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ قبر لیلیٰ کو دیکھ کر مجنوں ہلاک ہو جائے ، یا وہ لوگ کہ عزیز و اقارب تھے ، فرط غیرت سے مجنوں کو پتا نہیں بتاتے تھے ، اس لیے کہ مجنوں اس کے عشق میں بدنام اور مشہور ہو چکا تھا ؛ پھر وہ کیونکر ایسے شخص کو اپنی عزیز لڑکی کی قبر کا پتا اس عاشق بدنام کو دیتے ؛ میرے نزدیک اس وجہ کو زیادہ تر قوت و رجحان ہے ، اس لیے کہ مجنوں اور لیلیٰ کا وصال نہ ہونے کی بھی یہی وجہ ہوئی ۔ اگر لیلیٰ کے عشق میں مجنوں بدنام نہ ہو جاتا کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کا چچا انکار کرتا ۔ اگرچہ مجنوں اس معاملے میں بنا برحق تھا ، ہمارے بیان کے مطابق بے قصور تھا ۔ اس لیے کہ اس کا مکتب سے پہلے پہل نکل جانا صرف شوریدگی عشق کے سبب سے نہ تھا بلکہ شرم اور غصے کو بھی اس میں کچھ دخل تھا ۔

۱۔ بالجملہ مجنوں نے خود ہی قبر لیلیٰ کی دریافت کر لی ۔ جب وہ قبر لیلیٰ پر پہنچا اور اس کے دل نے گواہی دی بلکہ تصدیق کہ یہی قبر لیلیٰ ہے تو اس نے یہ شعر کہا ۔ (فرد) ''ارادو الیخفوا قبرها عن محبها ، و طیب تراب القبر ولی علی القبر'' ۔ ترجمہ : اور لوگوں نے چاہا کہ اس کی (لیلیٰ) قبر کو اس کے محب (عاشق) سے چھپا ڈالیں ۔ مگر بوئے خاک قبر نے اس کی قبر تک رہنمائی کی ۔'' اور اس شعر کو بہ تکرار پڑھتا رہا ۔ یہاں تک کہ مر گیا اور اسی کے برابر مدفون ہوا ۔

اے ناظرین والا تمکین ! میں دعا کرتا ہوں اور تم آمین کہنا کہ جس طرح عشق مجازی میں مجنوں کا انجام ہوا اسی طرح عشق حقیقی میں ہمارا تمہارا خاتمہ بالخیر ہو ! آمین ثم آمین !

قبر اس پردہ نشیں کی کیوں چھپاتا ہے فلک
بعد مُردن بھی وہی ہے پردہ داری ہائے ہائے
تا کجا یہ کوچہ گردی اب تو مرنے دے مجھے
اے دل شوریدہ کب تک ذوق خواری ہائے ہائے
بے خودی گور غریباں تک تُو ہی لے چل مجھے
تو ہی بتلا دے پتا اے بے قراری ہائے ہائے

بائیسواں سین——چمن تربت لیلیٰ

مجنوں

اے اجل اس سر زمیں سے آتی ہے بوئے صنم
بس یہیں تیار ہو تربت ہماری ہائے ہائے
شمع مدفن کی طرف کھنچتا ہے دل پروانہ وار

(لیلیٰ کے تصوّر سے)

ہے یقیں مجھ کو یہ ہے تربت تمہاری ہائے ہائے
حیف مجھ کم بخت کی اُلفت نہ راس آئی تجھے
خاک میں مل جائے میری دوست داری ہائے ہائے
تاب غم تجھ کو نہ تھی اصلاً کہ تھی نازک ادا
ہو سکی تجھ سے نہ میری غم گساری ہائے ہائے
سخت نادم ہوں نہ ہوتا آہ میں اے کاش اثر
چل گئی برچھی ترے سینے پہ کاری ہائے ہائے
بے قراری نے مری بجلی گرائی تجھ پہ حیف
اس دلِ مضطر کی ہے تقصیر ساری ہائے ہائے
زہر غم تیرا برا ہو آہ تو نے کیا کیا
جذب الفت سے تھی تجھ کو ساز واری ہائے ہائے
سوتی ہو کس نیند میں دیکھو تو میرا حال زار
ہائے اب تک ہے وہی غفلت شعاری ہائے ہائے

یہ ہماری شان ہے معشوق کو زیبا نہیں
کیوں پسند آئی ہے تم کو خاکساری ہائے ہائے

یاد آتی ہیں وہ زلفیں کالی کالی حیف حیف
یاد آتی ہے وہ صورت پیاری پیاری ہائے ہائے

(مجنوں کا قبر لیلٰی سے لپٹ کر مر جانا)

(باغبان آتا ہے)

باغبان

قبر لیلٰی سے لپٹ کر مر گیا مجنوں غریب
اب نہیں آتی صدائے آہ و زاری ہائے ہائے

عاشق و معشوق دونوں کو ملایا خاک میں
ہے یہی انجامِ راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

(پردہ گرتا ہے)

تتمۂ مرقع

(۱)

(سب مل کر گاتے ہیں)

یہ[۱] کس کے جلوے کا ہے تماشا کہ برق سی اک چمک رہی ہے
اسی سے روشن ہے ذرّہ ذرّہ وہی تجلی جھلک رہی ہے

کوئی نہ تھا اس جہاں میں ایسا کہ مرنے والوں کا ساتھ دیتا
مگر ترے وصل کی تمنا کہ یہ بلا حشر تک رہی ہے

مزار عاشق ہے جائے عبرت بجھی سر شام شمع تربت
سیاہ بختی کی ہے یہ شامت کہ چاندنی بھی سرک رہی ہے

۱۔ صنف کلام : غزل بحر متقارب مقبوض اثلم مضاعف یا شانزدہ رکن ۔ وزن : فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن دو بار۔ قصد شاعر : رجوعِ خیالات طرف معرفتِ شاہدِ حقیقی ۔

نہ پوچھ حالِ شہیدِ الفت کہ شمعِ مدفن ہے داغِ حسرت
بسی ہے بوئے وفا سے تربت کہ چادر گل مہک رہی ہے
یہ عشقِ خانہ خراب کیا ہے بتاؤ تو یہ عذاب کیا ہے
جگر میں یہ التہاب کیا ہے یہ آگ کیسی بھڑک رہی ہے
جو آہِ روشن کا اک شرارہ کبھی شبستانِ غم سے نکلا
تو روشنی اس کی ایک مدت زمیں سے تا فلک رہی ہے
ہوا اب انساں ذلیل و احقر کہ ہے بدی میں بھی سب سے بد تر
وگرنہ یہ بات پاک اکثر شریک بزم ملک رہی ہے

تتمۂ مرقع
(۲)

ہم[1] سے کب جلوہ ترا دیکھا گیا
مژدۂ دیدار سے غش آ گیا

سر گیا اس راہ میں اچھا گیا
میرے سر سے کب ترا سودا گیا

ظلمتِ حیرت سے یا رب دے نجات
اس اندھیرے گھپ میں دل گھبرا گیا

قطع ہے اس راہ میں پائے تلاش
پا گیا تیرا نشاں میں پا گیا

سنتے ہیں وہ یار کا جلوہ نہ تھا
حضرت موسیٰ[۴] کو کیوں غش آ گیا

۱- صنف کلام : غزل ، بحر رمل مجز و محذوف یا مقصور- وزن : فاعلاتن فاعلاتن فاعلن (یا رکن آخر) فاعلان ، دو بار- قصد شاعر : معرفت الہی -

صبر و ادراک و متاعِ جان و دل
جو گیا اس راہ میں اچھا گیا

دل لگا کر اس سے ہم رسوا ہوئے
پوچھیے دل سے کہ تیرا کیا گیا

کیا کہوں جلوہ فروزی حسن کی
دیکھتے ہی دیکھتے غش آ گیا

وہ اٹھے پہلو سے موت آئی مری
چھٹ گئیں نبضیں پسینا آ گیا

کیا کہوں عالم ہجوم یاس کا
ابر سا اک دل پہ میرے چھا گیا

سمجھے تھے مرزا[1] سے ہوگا غم غلط
ایسی باتیں کیں کہ دم گھبرا گیا

ختم شد

۱- مرزا - تخلص اول محمد ہادی رسوا -